



جبران خلیل جبران

مترجم عبد الباقی قاسمی

ادارہ فروغ اُردو لاہور

(جلد حقوق محفوظ)

۸۹۱۵

قیمت پندرہ

فروغی سلسلہ

بہار اول

مطبوعہ

پی. آر. بی. ایس. پریس
لاہور

ناشر

محمد طفیل ملک اور فروغ اردو
لاہور

ترتیب

۱۲۹	سارجم کر میرے نفس	۴	۱۱	عریض ناشر
۱۳۲	ساحلانات	۷	۱۲	پیش لفظ
۱۳۸	سار دوست کی واپسی	۹	۱۳	اپنا اپنا دس
۱۴۷	سورج تلے	۲۰	۱۴	تنہائی
۱۵۰	سار دشت کی کمانی اکی اپنی بانی	۲۵	۱۵	دور جدید
۱۶۷	مستقبل پر ایک نظر	۳۵	۱۶	میری حقیقت
۱۷۱	مانشی کی بستی	۵۵	۱۷	چند سوالات
۱۷۲	دو بچے	۷۶	۱۸	اے زین
۱۷۸	زمانہ اور قوم	۸۳	۱۹	نفس
۱۸۳	سار اپنی اپنی بولی	۱۰۶		

عرضِ ناشر

اس ادارہ کی طرف سے جبران کی یہ دوسری کتاب پیش کی جا رہی ہے
اردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ شام کے اس مشہور فلسفی کے انکار کو بعض
مصنفین نے اردو زبان میں پیش کیا۔ جبران جدید ادب کا دلدادہ تھا، وہ ہر چیز
میں انقلاب کا خواہاں تھا۔ وہ دھکی چھپی باتوں کو برملا کہتا، مزدوروں کی بے بسی
پر خود روتا اور دوسروں کو رولانے پر قادر تھا۔ اس نے اپنی ساری زندگی بگیوں
کے آئینوں پر بچنے اور سرمایہ داروں کی ریاکاری کو بے نقاب کرنے میں صرف کر دی۔
جبران اپنے ادبی اور تعمیری کارناموں کی وجہ سے زندہ ہے۔ زندہ رہے گا۔

میرے پیسے اصلاً پر مولانا عبد الستور صاحب نے جبران کے ان مضامین
کا اردو ترجمہ کیا اور یہ واقعہ ہے کہ انہیں بہت ہی زیادہ محنت کرنا پڑی۔ میل
خیال ہے کہ انہوں نے جبران کے خیالات کو پڑھا، سمجھا اور پھر لکھا ہے۔ اس لئے
مجھے امید کامل ہے کہ اس کتاب پر کہیں بھی ترجمہ کا گمان نہ ہوگا۔

یہ کتاب کیسی ہے اور اردو ادب میں کیا مقام حاصل کرے گی اس کا فیصلہ
قارئین کریں تو زیادہ مناسب ہوگا۔

محمد طفیل

میرا احمد سید مرزا قاسمی کے نام

پیش لفظ

جبران خلیل جبران عربی، انگریزی اور فرانسیسی تینوں زبانوں کا ادیب تھا۔ لیکن عربی ادب میں اسکو جو مقام حاصل ہے وہ صرف اسی کا حصہ ہے۔ عربی میں وہ اپنے حبِ مدِ طرزِ تحریر اور انوکھے خیال کا موجب تھا۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کی کتابیں اردو میں مختلف اداروں کی طرف سے پیش کی گئی ہیں ان میں سے اکثر انگریزی سے ترجمہ ہیں۔ پیش نظر مجموعہ اس لحاظ سے بھی زیادہ قابلِ توجہ ہے کہ اس کے تمام مضامین براہِ راست عربی سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔

یہ کتاب کسی ایسی کتاب کا ترجمہ نہیں جو کتابی شعل میں موجود ہو بلکہ یہ مجموعہ جبران کے ایسے مضامین کا ترجمہ ہے جو موقع بہ موقع عربی رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ عربی رسائل کی بے شمار فائلوں کو چھپان کر ان مضامین کا انتخاب عمل میں لایا گیا ہے۔

یہ مضامین جبران کی دیگر تصانیف سے بالکل مختلف ہیں۔ جبران کی اکثر تصانیف اس کے فلسفیانہ خیالات کو پیش کرتی ہیں لیکن پیش نظر مجموعہ میں اکثر و بیشتر ایسے مضامین ہیں جو عربوں کی زندگی، ان کی تعلیم اور اور ان کی ترقی پر بے لاگ تبصرہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور چونکہ عرب اور ہندوستان براعظم ایشیائیں شامل ہونے کے علاوہ اور بھی بہت سی خصوصیات میں مشترک ہیں اس بنا پر جبران کے یہ مضامین ہندوستان کی حالت اور اس کی موجودہ سیاست سے بھی گہرا تعلق رکھتے ہیں۔

ان خصوصیات کے پیش نظر یہ کہہ سکتا ہوں کہ جبران کی یہ کتاب اُردو دان طبقے کی نظر میں اس کے شاعر کا کی حیثیت رکھے گی۔

میں آخر میں اپنے مشفق بھائی مولانا عبدالقدوس قاسمی اور محترم دوست ملک محمد اسلم خان کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود مسودے پر نظر ثانی کی زحمت گوارا فرمائی اور اپنے مفید مشوروں سے مالا مال کیا

عبدالستوح قاسمی (نفل دیوبند)

زیارت کا کا صاحب
جزیری سلمہ

اپنا اپنا دیس

تمہارا لبنان اور ہے اور میرا لبنان اور۔

تمہارا لبنان سراسر مشکلات اور میرا لبنان آرائش و جمال۔

تمہارا لبنان خود غرضی اور فساد سے بھرا ہوا لبنان ہے اور میرے

لئے حسین خوابوں اور دلکش آرزوؤں سے بھرا ہوا لبنان۔

تمہارا لبنان ایک سیاسی گتھی ہے جس کو کھولنے میں زمانہ و مصروف عمل

ہے لیکن میرا لبنان وہ پہاڑیاں ہیں جو اپنی ہیبت و جمال کی وجہ سے آسمان کی بلندیوں تک پہنچنے کی کوشش میں ہیں۔

تمہارا لبنان بین الاقوامی مشکل ہے جس کو دنیا کی گردنیں ادھر ادھر پھینک رہی ہیں لیکن میرا لبنان صبح کی خاموش دایاں ہیں جن کے پہلو میں بیلوں کی گھنٹیاں بجتی ہیں اور رہٹ کی مچھی آوازیں کانوں میں بڑتی ہیں۔ تمہارا لبنان کشتی ہے ایک مغرب اور جنوب سے آکر بسنے والے انسان کی لیکن میرا لبنان ایک دُعا ہے رحمت ابوہریرہ صبح کے وقت جبکہ عہد اسے کھیتوں کی طرف جلتے ہیں اور ہر شام کو جب کہ کاشتکار کھیتوں سے واپس لوٹتے ہیں تو حرکت میں آتی اور آسمان کی بلندیوں تک پہنچتی ہے۔

تمہارا لبنان ایسی حکومت ہے جس کے امیروں کا کوئی شمار نہیں لیکن میرا لبنان وقار سے معمور ایک پہاڑ ہے جو مندر اور میدانوں کے درمیان اپنی جگہ پر اُس شاعر کی طرح ڈٹا ہوا ہے جو دنیا اور آخرت کے درمیان بیٹھا ہو۔

تمہارا لبنان ایک جیل ہے جس سے لٹری سچو کے مقابلہ میں اور سچو سے بھٹیرے کے مقابلہ میں کام لیا جاتا ہے۔ لیکن میرا لبنان وہ تصورات ہیں جن سے میرے کانوں میں چاندنی رانوں میں حسین کنواریوں کی رائیں لکھیاؤں اور کشیدہ گاہوں میں چھوٹی بچیوں کے گیت گونج رہے ہیں۔

تمہارا البنان مذہب کے امیر اور فوج کے قائد کے درمیان شطرنج کی بازی ہے لیکن میرا البنان ایک پاک عبادت گاہ ہے جب میری نگاہ اس پہنچوں پر چلنے والی مدنیّت سے اکتا جاتی ہے تو میں اپنی رُوح لے کر اس بات گاہ میں داخل ہوتا ہوں۔

تمہارا البنان دو انسانوں کی دُنیا ہے ایک وہ انسان جو ٹیکس دیتا ہے اور دُوسرا وہ جو ٹیکس لیتا ہے لیکن میرا البنان ایک تنہا انسان ہے جو چادروں کے سائے میں اپنی کھائی پرنکیہ لگا تے بیٹھا ہے اور وہ اللہ کی ذات اور سوج کی روشنی کے سوا ہر چیز سے بے پروا ہے۔

تمہارا البنان بندرگاہیں ہیں ڈاک ہے اور تجارت ہے لیکن میرا البنان نام ہے ایک دُور رس فکر کا، بھڑکتے ہوئے جذبات کا، اور ایک بلند پُرازدہ جملے کا جو زمین و فلک کے کان میں آہستہ سکتی ہے۔

تمہارا البنان نام ہے ملازمتیہ ملکوں، گورنروں اور مختلف افسروں کی بھیڑ کا، لیکن میرا البنان نام ہے شباب کی تیزی، پختہ عمری کے ارادے اور بڑھاپے کے فلسفے کا۔

تمہارا البنان بے عمل جماعتیں اور بیکار کا نفرینوں کا نام ہے لیکن میرا

لبنان روشن آگ کے ارد گرد مظلوموں کا نام ہے ایسی راتوں میں جہاں ٹھنڈی ہوائیں مچتی ہیں۔ اور سفید برف پڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔

تمہارا لبنان مختلف فرقہ بندیوں اور پارٹی بازیوں کی بجائے لیکن میرا لبنان اُن بے پردہ معصوم بچوں کی جماعت کا نام ہے جو ٹبلوں پر چڑھتے ہیں۔ پانی کی ندیوں سے کھیلتے ہیں اور میدانوں میں گیند لڑھکاتے پھرتے ہیں۔

تمہارا لبنان لکچر، غنموں اور مناظروں کا نام ہے لیکن میرا لبنان کمبوزوں کی آوازیں، شاخوں کی سرسراہٹ اور نشیبی زمینوں اور پہاڑی غاروں میں بانسریوں کی صدائے یادگشت

تمہارا لبنان مستعار دکاوت کے پردے میں پھنپھے ہوئے جھوٹ اور تقلید و تصنع کی چادریں لپیٹی ہوئی ریا کا نام ہے لیکن میرا لبنان ایک کھلی سچی صاف حقیقت — جو پانی کے تالاب میں دکھتی ہے تو اُسے اپنے پرتکا چہرے اور مناسب اعضا کے سوا کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

تمہارا لبنان کاغذ کے اوراق پر لکھے ہوئے قوانین و فطروں میں بند و عددوں اور عدد ناموں کا نام ہے لیکن میرا لبنان اُس فطرت کا نام ہے جو اسرارِ حیات سے واقف ہے۔ مگر واقفیت کے احساس سے لاعلم ہے

کے۔ بابت سب کچھ

اس شوق کا نام ہے جو بیداری میں غریب کے دامن سے چمکا رہتا ہے اور خواب میں اسے اپنا ہی وجود دکھائی دیتا ہے۔

نہارا لبنان نام ہے اُس بوڑھے کا جو اپنی داڑھی کو کپڑے بڑے ہے اُس کی پیشانی پر تیوری کے بل ہیں اور جسے اپنے سوا کسی کی فکر نہیں لیکن میرا لبنان نام ہے اُس جوان کا جو پراڈ کی طرح سینہ تانے کھڑا ہے صبح کی طرح سُکراتا ہے اور دُشٹر کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہے جس سے وہ خود اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔

نہارا لبنان کبھی شام سے کٹ جاتا ہے اور کبھی اس سے مل جاتا ہے اور ہر وقت سرحدات کی قطع و برید میں مصروف رہتا ہے لیکن میرا لبنان نہ کبھی کُتلتا ہے نہ کبھی ملتے ہے نہ اپنے درجے سے بڑھتا ہے اور نہ گھٹتا ہے۔

نہارا لبنان اور ہے اور میرا لبنان اور۔

نہارا اپنا لبنان اور اپنے لبنانی فرزند ہیں اور میرے لئے میرا لبنان اور اس کے فرزند!

آؤ! بتاؤں تمہارے لبنانی فرزند کون ہیں؟ تھوڑی دیر کے لئے سوچو

بہو منا بہ

میں ان کی حقیقت تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں۔

تمہارے لبنانی فرزند وہ ہیں جن کی رُوحیں مغرب کے ہسپتالوں میں پیدا ہوئیں اور جن کی ہوش اُن لالچی وائیل کی آغوش میں بیدار ہوئی۔ جو حلیں ہو کر منصف مزاجی کا پارٹ ادا کرتی ہیں۔

تمہارے لبنان کے فرزندان نرم شاخوں کی طرح ہیں جو بغیر اپنے رائے کے دائیں بائیں جھکتی رہتی ہیں اور جو صبح و شام تعیش ہوتی ہیں لیکن ان کو اپنے ارتعاش کا علم نہیں ہوتا۔

وہ اس کشتی کی طرح ہیں جو موجوں کے تھپیڑوں سے سکان اور بادبان کے بغیر ٹکراتی ہے لیکن اس کی کوئی راہ متعین نہیں ہوتی۔

تم بڑے سخت ہو۔ نہایت فصیح و بلیغ ہو۔ آپس میں ایک دوسرے کے مقابلہ پر لیکن فرنگیوں کے سامنے کمزور اور گونگے۔

تم آزاد مصلح اور بہادر ہو لیکن صرف اپنی ایٹیجوں اور اخبارات میں اور مغرب کے باشندوں کے سامنے فرمانبردار اور رجعت پسند۔ وہی ہو تم جو میند کوں کی طرح ادھر اُدھر ٹراتے پھرتے ہو اور کہتے ہو کہ ہم نے اپنے قدیم سرکش دشمن سے نجات پائی حالانکہ تمہارا وہ سرکش دشمن ابھی تک تمہارے جسموں میں

پوشیدہ طور پر موجود ہے۔

تم دہی ہو جو جنازہ کے آگے آگے ناپتے اور گاتے چلتے ہو لیکن جب تمہیں سامنے سے کوئی برات آتی دکھائی دیتی ہے تو تمہارا گانا بجانا سوگ اور تمہارا ناچ سینہ کو بی اور کپڑے پھاڑنے میں بدل جاتا ہے۔

تم دہی ہو جو جھوک سے اُسی وقت واقف ہوتے ہو جب خود تمہاری جیبیں خالی ہوں مگر جب تم ایسے لوگوں سے ملنے ہو جن کی جانبیں بھوک سے نکلی جا رہی ہوں تو تم ان پر ہنسنے ہو اور منہ پھیر کر کہتے ہو۔ یہ صرف بناوٹ ہے۔“

تم ایسے غلام ہو کہ جب زمانہ تمہاری زندگی آلود بیڑیاں اُتار کر چمکدار بیڑیاں پہنا دیتا ہے تو تم اپنے آپ کو آزاد سمجھتے ہو۔ (۹۵ - ۱۰۶)

یہی تمہارے لبنان کے فرزند ہیں تو مجھے بتاؤ کہ کیا ان میں ایسا بھی کوئی ہے جو لبنان کی گھاٹیوں میں ختم عزم بن کر اٹھے اسکے نام کو بلند کرے اور اس کے پانی میں شیرینی پیدا کر دے یا اس کی ہوا میں خوشبو پھیلائے؟ کیا ان میں ایسا کوئی ہے جو یہ کہنے کی جرأت کر سکے کہ جب میں مرد لگا تو لبنان اس دن سے بہتر حالت میں ہوگا جس دن میری پیدائش ہوئی تھی جو اس اعلان

کی جرات کے قابل ہو کر میری زندگی لبنان کی رگوں میں ایک قطرہ خون بن کر دوڑی یا اس کی پلکوں میں ایک آنسو کا قطرہ بن کر چمکی یا اس کے ہونٹوں پر سکراہٹ بن کر کھیلی۔

یہی تمہارے لبنان کے فرزند ہیں، تمہاری آنکھوں میں کتنی قدر منزلت کے مالک، لیکن میری نگاہ میں بڑے ہی حقیر، اب ذرا ٹھیکرو! میں اپنے لبنان کے فرزندوں کی تصویر تمہارے سامنے پیش کر دوں۔

میرے لبنان کے فرزند وہ کسان ہیں جو بغیر آباد زمینوں کو چمن اور باغات میں بدل دیتے ہیں۔

میرے لبنان کے فرزند وہ چرواہے ہیں جو اپنے مویشیوں کے ربوڑ کو ایک واوی سے دوسری واوی میں لئے پھرتے ہیں، جو بڑھتے، پھلتے پھلتے ہیں اور پھر یہی چرواہے ان کا گوشت نہیں غذا کے لئے اور ان کی اُدن پوشاک کے لئے بیٹا کرتے ہیں۔

میرے لبنان کے فرزند وہ باغبان ہیں جو انگور سے شراب کھینچتے ہیں اور شراب سے مر کر بنتے ہیں۔

میرے لبنان کے فرزند وہ انبائے آدم ہیں جو شہنشاہت کے کیڑوں کی پرورش

کہتے ہیں اور وہ تو اکی بیٹیاں جو رشیم کا تھی ہیں۔
 میرے لبنان کے فرزند وہ شوہر ہیں جو کھیتی باڑی کرتے ہیں اور وہ
 بیویاں ہیں جو معمران اکٹھا کرتی ہیں۔
 میرے لبنان کے فرزند معمار، کمار، جلاہے اور ناقوس و جرس بنانے
 والے لوہار ہیں۔

میرے لبنان کے فرزند وہ دیہاتی شاعر ہیں جو بڑھڑیاں اور گیت بناتے
 ہیں اور جو ہر روز اپنے دل کا خون نئے نئے پیالوں میں ڈال کر پیش کرتے
 رہتے ہیں۔

میرے لبنان کے فرزند وہ ہیں کہ جب وہ مادرِ وطن سے جدا ہو جاتے
 ہیں تو ان کے دلوں میں شجاعت بازوؤں میں قوت کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور
 پھر ساری زمین کی نیکیاں اپنے ہاتھ میں اور دھڑیوں سے چھینے ہوئے تاج سر
 پر لے کر واپس لوٹتے ہیں۔

میرے لبنان کے فرزند وہ ہیں جو اپنے ارد گرد کے ماحول پر ہر لمحہ غائب
 آتے ہیں۔ جہاں بھی دیکھنے میں آئیں۔ لوگوں کے دل ان کی طرف کھینچے جاتے ہیں
 وہ وہی ہیں کہ جن کی پیدائش عجیب و غریب ہوئی ہے اور علم کے عالیشان

محلات میں آخری آرام گاہ بناتے ہیں۔

یہی وہ چراغ ہیں جس کو زمانہ کی تند و تیز ہوائیں بجھا نہیں سکتیں یہی وہ ذات ہے جس کو زمانہ خراب نہیں کر سکتا۔

یہی ہیں وہ جو پوری ثنابت قدمی سے حقیقت، جمال اور عروج کی طرف بڑھتے ہیں۔

اب بتاؤ کہ تمہارے لبنان کے فرزندوں میں سے ایک صدی کے بعد کیا باقی رہیگا؟

کل کے لئے تم جھوٹے دعووں اور بُر دلی کے سوا اور کیا چھوڑو گے؟
کیا تم سمجھتے ہو کہ زمانہ دھوکے، فریب اور سُستی و کاہلی کے مظاہر کو اپنے حافظہ میں جگہ دیتا ہے؟

کیا تم سمجھتے ہو کہ غبار کے گردیاں میں مرث کی تصویریں اور قبروں کے نشان باقی رہتے ہیں؟

کیا تمہارا یہ گمان ہے کہ زندگی اپنے نئے جسم کو پھٹے کپڑوں سے ڈھانپنے کی بجائے کوشش کرتی ہے؟

میں سچائی کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ زیتون کا چھوٹا سا پودا جس کی ایک
 دہائی لبنان کی گھاٹیوں میں کاشت کرتے تھے تمام اعمال اور ان کے نتائج
 سے زیادہ دیر پا ہے اور لکڑی سے بنا ہوا اہل کامیزہ جسے کاشتکار لبنان
 کی وادیوں میں گھیٹا ہے، تمہاری تمام خوش آئند امیدوں اور چھوٹی آرزوؤں
 سے زیادہ بہتر ہے۔

حقیقت گواہ ہے کہ کیتوں میں بننے والی ندی کی آواز تمہارے گلا
 پھار پھا کر بولنے والے خطیب کی آواز سے زیادہ دیر پا ہے میں کہتا ہوں
 کہ تم کسی کام کے نہیں ہو، اگر تم سمجھتے کہ تمہارا وجود بیکار ہے تو اس وقت میرے
 نفرت کے جذبات رحم اور مہربانی کے جذبات میں بدل جاتے۔ کاش میری آواز
 تمہاری رُوحوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دے۔

تمہارا لبنان آدر ہے اور میرا لبنان آدر۔

تمہارے لئے تمہارا لبنان اور اس کے فرزند میں شہر یکہ تم بانی کے ملبوں
 کو دیر پا سمجھ کر ان پر قناعت کر سکو۔

لیکن میں اپنے لبنان اور اس کے فرزندوں پر قناعت کئے بیٹھا ہوں

اور میری اس قناعت میں حلاوت سکون اور اطمینان ہے۔

تمنائی

حیات تمنائی کے سمندر میں گھرا ہوا ایک جزیرہ ہے۔

حیات ایک ایسا جزیرہ ہے۔ جو آرزو کے ٹیلوں، خواب کے
درختوں، وحشت کے پھولوں اور پیاس کے چشموں سے مرکب ہے اور وہ
تمنائی کے سمندر کے درمیان واقع ہے۔

بھائی حیات تمام مالک و درجن اتر سے گٹا ہوا ایک جزیرہ ہے
چاہے تم جتنے جہاز اور کشتیاں چلا کر دوسرے کناروں پر لگا لویا تمہارے
جزیرے کے کنارے پر چاہے جتنے بحری بیڑے اور عمارات

کھڑی کر لی جائیں۔ اس کی تینائی پھر بھی باقی رہتی ہے اس لئے کتم ہی اپنی
مستزوں کے تینا مالک ہو، تمہارے غم کی آواز اوروں کے کانوں تک نہیں
پہنچتی اور تمہارے اسرار اور بھیڑوں سے تمام کائنات بے خبر ہے۔

بھائی! میں نے تمہیں دیکھا کتم سونے کے ڈھیر پر بیٹھے ہوئے اپنی
ثروت کی خوشیوں میں مگن، اپنی سرمایہ داری کی تعلیموں میں سرشار تھے۔ تم مجھ
رہے تھے کہ سونے کی ہر ڈلی نظر نہ آنے والی تار کے ذریعہ لوگوں کے افکار کو
قیامے خیالات سے ملاتی اور ان کے رجحانات کو تمہاری جانب جھکاتی ہے
میں نے تمہیں دیکھا کہ تم ایک فاتح اعظم کی طرح اپنی سنہری (دولت کی)
فوج کے ذریعہ مضبوط قلعوں پر حملہ کر کے انہیں توڑ کر رکھ دیتے ہو اور ناقابل
تنبیہ مستحکم مقامات کو اپنے دست تصرف میں لے آتے ہو لیکن جب میں نے
دوبارہ گہری نظر سے دیکھا تو تمہارے خزانوں کی دیواروں کے نیچے تینائی
میں پھڑکتا ہوا ایک دل نظر آیا، جو اس پرندے کی مانند تھا جو سونے اور
جواہرات کے قفس میں محبوس ہو اور پیاس سے تڑپ رہا ہے مگر
اسے پانی کا ایک قطرہ میسر نہیں آتا۔

بھائی! میں نے تمہیں غریبی کے تخت پر بیٹھے ہوئے دیکھا لوگ تمہارے

اور گرد کھڑے تمہارے نام کی جے پکار رہے تھے تمہاری نیکیاں گنی جا رہی تھیں۔ تمہارے احساسات کی سرا جابجا تھا اور تمہاری طرف یوں آنکھیں بھاڑ پھاڑ کر دیکھتے گویا وہ کسی نبی کے دربار میں کھڑے ہیں اور ان کو یقین ہو کہ اس کی رُوح کے ساتھ اُن سب کی رُوحیں عالمِ بالا کی سیر کو اڑ جائیں گی اور تمہاری لگا ہوں میں قوت اور غلبہ کے آثار چھپتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تم رُوح ہو اور وہ جسم ہیں لیکن جب میں نے تمہیں پھر دیکھا تو میں نے تمہاری تنہا ذات کو تمہارے تخت کے پاس ایک طرف کھڑا پایا۔ وہ اپنی اجنبیت کے درد سے کرا رہی تھی۔ اور اس کے چہرے سے وحشت برس رہی تھی۔ میں نے اسے دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھ ہر طرف بڑھا بڑھا کر رحم و کرم کی طالب ہے۔ پھر میں نے اسے دیکھا کہ وہ لوگوں کے سروں کے اوپر سے کسی دُور مقام پر نظر ڈال رہی ہے۔ جہاں اس کی وحدت و انفراد کے موا کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

بھائی! میں نے تمہیں ایک حسین عورت کے ساتھ محبت کی باتوں میں مصروف پایا۔ تم اس کی پیشانی پر دل سے نکلے ہوئے خون کے قطرے بہا رہے تھے اور اپنے ہزموں سے اس کی نرم و نازک تھیلیوں پر لگا تا رہے ہو۔ برسا رہے تھے تاکہ

و محبت کی کروں سے چمکتی ہوئی آنکھیں تمہارے چہرہ پر چمکتے ہوئے تھی
 اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی میں نے یہ دیکھ کر اپنے دل میں
 کہا کہ محبت نے اس شخص کی تنہائی کو ختم کر دیا اور اب اس کی وحشت کے
 دن بیت گئے۔ یہ اب اس رُوحِ کَل سے مل گیا ہے جس کے ساتھ ہجرو
 فراق کے ٹوٹے دلِ محبت کے واسطے سے جڑ جاتے ہیں لیکن جب میں
 نے پھر تمہاری جانب دیکھا تو تمہارے دل کے اندر لپٹ ہوا ایک ادبے چین
 دل نظر آیا جو اپنے بھیدوں کو اس حسینہ کے سر پر آنسو کی شکل میں بانچا رہتا تھا لیکن بے بس
 تھا محبت سے پچھلتے ہوئے دل کے پار ایک اور دل نظر پڑا جو آسمان پر
 چھائے ہوئے دھند کی طرح تنہا نظر آ رہا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ
 تمہاری جُوبہ کی پتیلیوں میں آنسو بن کر گرے لیکن وہ ایسا کرنے سے عاجز تھا۔

بھائی! یہ سچ ہے کہ تمہاری حیات تمام منازل اور تمام جانداروں سے
 الگ ایک منزل ہے تمہاری حقیقی زندگی ظاہری راستوں سے بہت دُور
 اور تمہارے ظاہری جسم سے بالکل جدا ایک منزل ہے اگر تمہاری حقیقی منزل
 نزدیک ہے تو تم اپنے ارادہ کو دے ماحول سے اسے ردِ دشمن نہیں کر سکتے اگر

منزل خالی ہے تو اس ظاہری جسم کے محاسن سے تم اسے بھر نہیں سکتے اگر یہ
 پود کسی بیابان میں تنہا کھڑا ہے تو تم اسے اوروں کے دکائے ہوئے باغ
 میں منتقل نہیں کر سکتے اور اگر کسی ہپاڑ کی چوٹی پر موجود ہے تو غیروں کے پاؤں
 سے روندی ہوئی زرخیز دلدلیوں میں اسے اتار نہیں سکتے۔

تمہاری یہ زندگی وحدت و انفراد میں گھری ہوئی ہے۔ اگر یہ وحدت
 انفراد نہ ہوتا تو میں اتم الگ الگ بتے اگر یہ وحدت نہ ہوتی تو تم اپنی
 آواز سن کر سمجھنے کہ میں ہوں رہا ہوں اور اگر میں منہ لاچہرہ دیکھتا تو مجھے خیال
 آتا کہ میں اپنا چہرہ آئینہ میں دیکھ رہا ہوں۔

دورِ جدید

مشرق میں دو مختلف نظریے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ فکرِ قدیم اور فکرِ جدید اور یقینی ہے کہ اپنے قومی کی کمزوری اور عزم کی بے ثباتی کی وجہ سے فکرِ قدیم مغلوب ہو گی۔

مشرق میں بیداری نیند سے مقابلہ کر رہی ہے اور بیداری فاتح بن کر رہے گی۔ اس لئے کہ سورج بیدار مچا قاتل ہے اور صبح اس کی فوج کا کام ہے ہی ہے۔

مشرق کل تک ایک خشک وسیع بیابان تھا لیکن آج سدا بہار بن کر قبروں میں مدفون انسانوں کو پکار پکار کر جگا رہا ہے اور ان کو زمانہ

کے ساتھ چلنے پر مجبور کر رہا ہے۔ جب یہ اپنے گیت گانے لگتا ہے تو سردی کا مارا ہوا مردہ کفن بچھاڑ کر چلنا شروع کر دیتا ہے۔

مشرق کی فضا میں زندگی کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں جو بڑھ بڑھ کر حساس نفوس کو اپنے ساتھ ملا رہے ہیں اور مل کر بھاگنے والے قنوب کو اپنے ساتھ لانے کیلئے سرگرم عمل ہیں۔

آج مشرق کے دوسروں میں ایک بوڑھا سردار جو احکام صادر کرتا ہے بعض چیزوں سے لوگوں کو روکتا ہے اور اس کے ہر حکم کی تعمیل کی جاتی ہے مگر خود وہ قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے پیر فرقت کی مانند ہے۔ دوسرا سدا فطری قوانین کی طرح خاموش اور حق کی طرح مطمئن ہے اور وقار سے دیکھ رہا ہے لیکن وہ آستین چڑھائے ہوئے تیار کھڑا ہے اس کا عزم اس کے چہرے نمایاں ہے اس کو اپنی فہم و فراست پر پورا اعتماد ہے۔

آج مشرق میں دو ہی انسان ہیں، کل کا انسان اور آج کا انسان
مشرق میں بسنے والے انسان! گویا، نژاد کو خفا انسان ہے؛
میرے قریب آتا کہ میں تجھے غور سے دیکھوں تب سے مل کی گلتیوں کا

جائزہ ٹوں تیرے ظاہری آثار سے اندازہ کر دس کہ تو کیلئے ہے روشنی کی
طرف بڑھنے والا یا تاریکی کی جانب گرنے والا !
آؤ ! مجھے بتاؤ تم کون ہو اور کیا ہو ؟

کیا تم وہ سیاسی لیڈر موجود دل میں منصب بے باندھ رہا ہو کہ اپنی قوم
سے ذاتی نفع حاصل کرے یا وہ غیر مجاہد ہو جو ہر وقت یہ ارادہ کر کے کام
کرتا ہے کہ قوم کی خاطر شہید ہو جائے ؟

اگر تو پہلا ہے تو تو ایک خود رد اور بیکار پودا ہے اور اگر تو دوسرا ہے
تو پھر تو جنگل کا ایک آہرا تاجر اکھیت ہے۔ سنا اور دیکھا ہے

کیا تم لیے تاجر ہو جو لوگوں کے روزمرہ کام آنے والی چیزوں کو اس
نگاہ سے خریدتا ہے کہ ان کو اپنے پاس رکھ کر ضرورت کے وقت بیس گنی قیمت
وصول کرے ؟ یا تو وہ انسان ہے جو اس کو ششیں میں لگا ہو کہ کاشتکار اور
جُلا ہے کے درمیان مال کے تبادلہ کے لئے آسانیاں فراہم کرے۔ محتاج اور
محتاج الیہ کے درمیان کوڑی بن کر دونوں کو اور خود بھی دونوں سے انصاف
فائدہ حاصل کرے۔

اگر تو پہلا ہے تو تو مجرم ہے چاہے تو مالیشان کو ٹھہلی میں رہے یا جیل کی

تنگ و تاریک کوٹھڑی میں اور اگر دوسرا ہے تو پھر تو محسن ہے چاہے لوگ تنہا
مکمل گزار ہوں یا نہ ہوں۔

کیا کوئی مذہبی رہنما ہے جو قوم کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر اپنے لئے
جُتے اور عبا میں تیار کرتا ہے ان کی سادہ ولی سے اپنے سر پر رکھنے کے لئے تاج
تیار کرتا ہے اور شیطان کی بُرائیوں کو کھول کھول کر بیان کرتا ہے لیکن خدایا
کی خیرات پر عیش اُڑاتا ہے؟ یا تو وہ مفتی اور پرنسز کا رانمان ہے جسے فرد کی
بہتری میں اُمت کی ترقی نظر آتی ہے اور اپنی رُوح کی گمراہیاں اسے رُوح
مُل کی طرف چڑھنے کیلئے سیرھی نظر آتی ہیں؟

اگر تو پہلا ہے تو تو ملحد اور کافر ہے چاہے تو دن کو روزہ رکھے اور رات
عبادت میں گزارے اور اگر تو دوسرا ہے تو پھر تو حق کے باغات میں خوشبودار
مکلی ہے۔ چاہے اس کی خوشبو لوگوں کے مشام تک پہنچ کر صالح ہو جائے یا فسد
میں اُڑ کر اور کھیلوں کی خوشبودار جگ سے مل کر محفوظ ہو۔

کیا کوئی ایسا مضمون نگار ہے جو اپنا علم و فکر بازار میں بیچتا پھرتا ہے جو
دین کے مصائب و آلام سے اخبار کی وجہ سے بھٹا اور پھوٹتا ہے اور گدھ کی
طرح مڑی ہوئی حُموار لاشوں کے سوا کسی پر اس کی نظر نہیں پڑتی یا تدن کے

منبروں میں سے ایک منبر پر کھڑا ہوا اور اعظمیٰ جزو ماد کے حالات سے خود نصیحت حاصل کر چکے بعد لوگوں کو متنبہ کرتا ہے۔

اگر تو پہلا ہے تو تو انسانی جسم پر بڑی ہوتی پھنسی ہے اور اگر تو دوسرا ہے تو پھر تو نوع انسانی کیلئے تریاق کی دوا ہے۔

کیا تو ایسا عالم ہے جو اپنے سے اُدبچے افسروں کے سامنے ذلیل اور اپنے ماتحت لوگوں کے سامنے مغرور ہو کر آتا ہے۔ وہ اپنی ہر حرکت سے غریبوں کے مال پر ڈاکو ڈالتا ہے وہ کسی غریب کے ساتھ کوئی قدم ایسا نہیں اٹھاتا جس میں اس کا اپنا ذاتی فائدہ نہ ہو یا تو قوم کا ایسا خادم ہے جو لوہی یا منتقل سے ماتحت افراد کے انتظام میں لگا رہتا ہے۔ ان کی خیر خواہی میں ماتوں کو جاگتا ہے اور ان کی آرزوئوں کی تکمیل کی انتہائی سعی کرتا رہتا ہے۔

اگر تو پہلا ہے تو تو قوم کے کھیلانوں میں کاربند ہے اور اگر تو دوسرا ہے

تو پھر تو ان کی خواہشات کے لئے برکتِ خداوندی ہے۔

کیا تو وہ شوہر ہے جو ایک ہی چیز کو اپنی بیوی کے لئے حرام اور اپنے جائز سمجھتا ہے جو آزادوں سے جلتا پھرتا، خوشی میں اترتا ہے اور بیوی کے گھمنے کی چابی اپنی جیب میں لئے پھرتا ہے، جرحی میں آتا ہے کھاتا ہے۔ اور

۱۔ اس کی بیوی ٹوٹی ہوئی کُرسی پر تنہا بیٹھی رہتی ہے؛ یا تودہ ساتھی ہے جو اپنی رفیقہ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بغیر کوئی کام نہیں کرتا یا جو اس کے مشورے کے بغیر کوئی امادہ نہیں کرتا اور اسے اپنی خوشیوں میں شریک کئے بغیر کوئی کام انجام کو پہنچنے نہیں دیتا۔

اگر تو بھلا ہے تو تو زمین و درختوں میں رہنے والی اور کھال کا لباس پہننے والی قوم میں سے ہے جو مدت ہوئی ختم ہو گئی اور اگر تو دوسرا ہے تو پھر تو اس قوم کا پیشرو ہے جو صبح کی روشنی کے ساتھ عدالت اور انصاف کی طرف تیزی سے گامزن ہے۔

کیا تو ایسا مضمون نگار اور نقاد ہے جو اپنے آپ کو ہم سب پر فوقیت دینے کی کوشش کرتا ہے مگر اس کے بوسیدہ انگارے مافی کے ان ناکارہ مراکز کا چکر لگاتے ہیں۔ جہاں اقوام کے پرانے جتھروں اور ناکارآمد جتھروں کا ڈھیر ہے

یا تو ایسی صحیح فکر کا مالک ہے جو اپنے ماحول کو — بہوت اپنی نظر میں رکھتا ہے تاکہ مفید اور مضرا شیا کو پہچانے اور اپنی عمر مفید اشیاء کی ترقی اور مضرا شیا کی تخریب میں صرف کرے۔

اگر تو پہلا ہے تو پھر تو فاسد خرابی ہے اور فضول کندہ زہنی اور اگر تو
دوسرا ہے تو تو بھوکوں اور پیاسوں کیلئے پانی کی مانند ہے۔

کیا تو وہ شاعر ہے جو امیروں کے دروازوں پر باب بجاتا ہے۔
اور میلوں میں لفظوں کے پھیل بکھیرتا پھرتا ہے اور سڑی ہوئی لاشوں کے پیچھے
پیچھے منہ میں نیم گرم پانی کا بھرا ہوا اسفنج لئے پھرتا ہے جسے مقبروں میں پہنچ کر
زبان اور ہونٹوں سے دبایا جاتا ہے۔ یا جو فطری شاعر ہے جس کے ہاتھ میں
سازِ فطرت ہے جس کے تاروں سے ربانی نغمے نکلتے ہیں۔ کہ
ہمارے دل میا خستہ اُن کی طرف کچھ چلے جلتے ہیں جو ہمیں زندگی کے مسائل
اور زندگی میں پیش آنے والے جمال اور خوف کے سامنے تھیر کھڑا کر دیتے
ہیں۔

اگر تو پہلا ہے تو تو ان شعبہ ہاؤں میں سے ہے جو ہمارے دلوں
میں کسی جذبہ کے پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ اگر وہ رو ہیں تو ہم مینتے
ہیں اگر وہ خوش ہوں تو ہم تنگیں ہر جاتے ہیں اور اگر تو دوسرا ہے تو تو ہماری
ظاہری آنکھوں کے پیچھے سے شعاعیں پھینکنے والی بصیرت ہمارے قلوب
میں سمایا ہوا شیریں شوق اور ہمارے حسموں سے دور خدائی خواب ہے۔

میں کتا ہوں کہ مشرق میں دو جلوس ہیں۔ ایک بڑھے کو ذرا پستوں کا
جلوس جو ٹیڑھی لڑکیوں کا سہارا لیتے ہوئے چلتے ہیں اور اس کے
باہر دواؤں پر سے نیچے کی طرف لڑھکتے جا رہے ہیں اور ہانپ رہے ہیں۔ دوسرا
جلوس ان جوانوں کا ہے جو تیزی سے بلندی کی طرف بڑھ رہے ہیں
گویا کہ ان کے پاؤں پر پر لگے ہوئے ہیں۔ وہ وہیں زور زور سے پکارتے ہیں
گویا کہ ان کے گلے میں تار ہیں۔ وہ گھائیوں کو یوں پھانڈ کر جا رہے ہیں جیسے
کہ مہا پڑوں کی چوٹیوں پر کوئی قوت ان کو کھینچ رہی ہے یا کوئی مادہ ہے جو
ان کی عقل کو سلب کر رہا ہے۔

اے مشرق کے رہنے والو! تم کس جلوس میں ہو اور کن کے ساتھ

جل رہے ہو؟

اپنے نفس پوچھو۔ رات کی سکون پر در فضا میں جب ماحول کے اثرات
نائل ہو چکے ہوں۔ اس سے جواب طلب کرو تم کل غلام بننا چاہتے ہو یا آزاد؟
میں تم سے کہتا ہوں کہ کل کے خواب دیکھنے والے اس زمانہ کے جنادہ
کے پیچھے جا رہے ہیں جس نے ان کو پیدا کیا اور جسے انہوں نے پیدا کیا۔ وہ
ایسی رستی کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں جس کے ہر سر ہوا گئے کو زمانہ

نے بوسیدہ کر رکھا تھا اور غریب وہ رسی ٹوٹنے والی ہے جب بھی وہ ٹوٹے گی اُسی وقت اس کو تھام کر چلنے والے نسیان کے گہرے گڑھے میں دفن ہونگے یہ لوگ ایسے مکان میں رہتے ہیں جس کے ستون گرنے والے ہیں جب بھی کوئی تیز آندھی چلے گی۔ اور بہت جلد چلے گی۔ تو یہی مکان ان کے اُور گرینگے اور ان کی قبروں کا کام دینگے۔ میں کہتا ہوں کہ ان کے اقوال تنازعات، تصانیف کو یوان ادران کے تمام اعمال بھاری زنجیریں ہیں جو اپنے بوجھ کی وجہ سے ان کو اپنے پیچھے پیچھے کھینچتے پھرتے ہیں اور یہ لوگ اپنی کمزوری کی وجہ سے ان کو اپنے پیچھے کھینچنے سے قاصر ہیں۔

لیکن نیکو کے فرزند وہ ہیں کہ جب زمانہ نے ان کو بچا رہا تو وہ ثابت قدمی سے اپنا سرائے قائم رکھ کر چل پڑے یہی زمانہ جدید کے لئے صبح کی مثال ہیں۔ نہ دھواں ان کی روشنی کو روک سکتا ہے نہ زنجیروں کی جھنکار ان کی آواز کو روک سکتی قدرت رکھتی ہے اور نہ مدت کے ایسا وہ پانی کی بدبو ان کی خوشبو کو تک پر غالب آ سکتی ہے۔ وہ بڑی تعداد کی ملشمار جماعتوں میں گھری ہوئی محدود افراد کی جماعت ہے لیکن سرسبز شہر میں وہ سب کچھ ہے جو خشک جنگل میں نہیں۔ اور گہیوں کے ایک خوشے میں وہ سب کچھ پایا جاتا ہے جو نیلیوں کے ڈھیر

میں پانا مشکل ہے۔ وہ نامعلوم جماعت ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔ وہ پہاڑ کی بلند چوٹیوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں ایک دوسرے کی آواز سنتے ہیں اور آپس میں سرگوشیاں کرتے رہتے ہیں لیکن گہرے گڑھے اندھے ہوا کرتے ہیں جو کسی چیز کو دیکھ نہیں سکتے اور بیرے ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی کی آواز سنا کرتے ہیں۔ وہ گھجور کی اس گٹھلی کے مانند ہیں جو اسٹک طرف سے زمین پر گرے ایک نئی شان سے سر بلند ہونے کی خاطر اپنا چھلکا پھاڑ کر نکلی اور سورج کے سامنے سرسبز و شاداب بن کر کھڑی ہو گئی اور عنقوب وہ ایک ایسا تار و زخم بن کر رنگی جس کی جڑیں زمین کے حلق سے اُتری ہوئی ہو گئی اور جس کی شاخیں آسمان سے باتیں کرتی ہو گئی۔

میری حقیقت

جسمانی زندگی کے اس قید خانہ میں آنے سے پہلے ہم کہاں تھے اور
کیا تھے ؟

یہ سمجھا رہے محسّاس اور جسمیں میں بقرار روحیں ہمارے جسموں میں قامت
سے پہلے کہاں تھیں اور کیا تھیں ؟

اس سے قبل کہ زمانہ ہمیں بے معنی آواز بنا کر دُنیا میں لایا ہو کہ
امینان کی جگہ سانس لے رہے تھے ؟

ہمارے نفوس بن اشکال میں بدلنے سے قبل کس حالت

میں تھے ؟

خوابوں کی دنیا میں بولتی ہوئی یہ بیداری خیالات سے آراستہ
غور و فکر، یہ خوشی اور غم، محبت اور نفرت کے دھماکوں سے بندھی ہوئی آرزو
مادں کے لہن سے پیدا ہوئی یا تپن کی فضا میں
کیا اس سے پہلے کہ ذوقِ موت نہیں زندگی کی گود میں لے آیا ہم کچھ نہ

تھے ؟

نہوش سنبھالتے ہی میں نے یہ سہالات اپنے نفس سے پوچھے۔ میرے
نفس نے ان سہالات کے جواباً ایسے مبہم کلمات کی شکل میں دینے جو میری سمجھ
سے بالاتر ہوتے۔ میرا فکر ان کلمات کو ایک گہری خاموشی کی طرف لے گیا۔
(جس طرح ہونٹ کے ٹکڑے پانی میں گر کر مانی ہو جاتے ہیں)

کل ایک نیا واقعہ میرے سامنے آیا جو قریب تھا کہ غیب کے اسرار
مجھ پر کھل دیتا اور وجود کے بھیدوں سے مجھے اٹکا کر دیتا۔ یہ واقعہ میری
خیالی دنیا کو اس زمانہ کے قریب لے گیا جب میرے ظاہری جسم کا طور
نہیں ہوتا تھا۔ میں نے ایک آدمی کو دیکھا جو اپنے نفس کے متعلق
کچھ بتا رہا تھا۔ اس کے الفاظ سے میں اس قدر مسحور ہوا کہ میرے محدود فکر

اور کم عقلی کے درمیان ایک باریک رشتہ استوار ہونے لگا۔
 میں نے سلیم نجومی کو دیکھا جو خود اپنی تعریف آپ کر رہا تھا۔ وہ ماضی بعید
 کے اُن واقعات کو بیان کر رہا تھا جو اس کے ذہن میں محفوظ تھے۔ مجھے یقین
 آگیا کہ میں ایک ایسے انسان کے حضور میں کھڑا ہوں جو اور انسانوں سے
 مختلف ہے۔ وہ ایسی نازک اور باریک باتوں کو سمجھتا ہے جن کی نہ تکس
 اوروں کی عقل کی رسائی نہیں اور ایسی باتیں یاد رکھتا ہے جن کی یاد اوڑں
 کے ذہن سے مٹ چکی ہے۔

میں سلیم نجومی کو اٹھاڑ برس سے جانتا تھا۔ ہم نے اس کا نام ”مجدد“
 رکھا تھا اس لئے کہ وہ جب بھی ہم میں سے کسی کو دیکھتا تو ایسی نظروں سے
 گھورتا جن سے تجربہ و تعجب ٹپکتا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اس سے قبل
 ہمیں کبھی نہیں دیکھا۔ اگر ہم کبھی اس کا نام لے کر اسے بلاتے تو وہ تین چار بار
 بلانے سے قبل یہیں جواب نہ دیتا۔ اگر ہم کبھی اس سے کچھ پوچھتے تو تھپٹی ہوئی آنکھوں
 سے ہمیں دیکھتا، سر ہلاتا اور یوں معلوم ہوتا کہ گویا ہم اسے کسی ایسی زبان میں
 مخاطب کر رہے ہیں جس کا کوئی لفظ عمر بھر میں اس کا نون نے نہیں سنا۔ اور
 کبھی کبھی وہ نہایت دھیمی آواز اور معمولی حرکت سے بھی یکدم گھبرا اٹھتا جس طرح

کوئی سوچتا تھا بندوق کی آواز سن کر یہ چیز تک اٹھے۔ اگر وہ بیٹھا ہوتا تو
 یکدم کھڑا ہو جاتا اور اگر کھڑے کھڑے آواز اس کے کان میں پڑتی تو بھاگتا شروع
 کر دیتا۔ لیکن اس طرح کھڑے رہنے کے باوجود وہ حدود رجبے کا زیرک تھا۔ اور
 بعض چیزوں میں تو اس کا فکر نہایت دور رس تھا۔ علم موسیقی اور علم طبابت
 میں اس کو کمال حاصل تھا۔

میں نے جب بھی اسے عربی کی شروں عربی کے اوزان اور اس کے
 معانی کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے سنا تو اس کی نکتہ شناسی اور دقت کو
 دیکھ کر متعجب ہوا۔ اسی طرح جس موقع پر بھی میں نے اسے موجودات کے خفایاں
 اور گہرے ہونے زمانے کے متعلق بحث کرتے دیکھا تو میں نے یہ تصور کیا کہ میں
 کسی ماہر منطقیت و فلسفہ کی مجلس میں بیٹھا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ اس کو کسے
 ہوئے مجذوب کی طرح میں دوا اثر پوشیدہ ہیں جن تک اوروں کی
 ارواح کی رسائی نہیں اور اس کی مدد پر ہی ایسی بیداری پہنچا ہے جس
 کی خبر دنیا کے ہوشمند اور خرد دار انسانوں کو نہیں۔

سلیم نجمی میں ایک اور عجیب بات پر غور آئی کہ وہ گفتگوں تک سوچ
 کی طرف آنکھیں کھولے دیکھتا رہتا۔ اس وقت دیکھنے والے کو یہ معلوم ہوتا

کہ اس کی آنکھیں شیشے کی بنی ہوئی ہیں۔ نہ اس کی پلکیں چمکتی ہیں اور نہ اس کی آنکھیں خیر ہوتی ہیں۔ میں نے اُسے اس عادت سے روکنے کی کوشش کی، اور اسے دُرِایا کہ ایسا کرنے سے تیری آنکھوں کی مینائی جاتی رہے گی لیکن اس نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ اُو دن کے اوقات زمین کی تاریکی چک رہی ہے میں گناہ کرتا ہوں اور گدھو سی وقت سورج کو دیکھتے ہوئے گناہ کرتا ہوں لیکن اس کے باوجود کیا تو نے کبھی اسی گدھ کو اندھا دیکھا ہے؟

تین سال گزر گئے۔ ہم نے سلیم کو نہیں دیکھا میں اور میرے ساتھی کبھی کبھی اس کی عجیب و غریب حرکات کو باہر کے سننے لگتے تھے۔ اور کبھی اس کی ناقص قیمت معذرت پر نہ رو کر کے اپنی علیحدت کو بڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔ ہم نے بگوں سے اس کے متعلق بہت پوچھا لیکن کوئی بھی ایسا نہ ملا جو اس کے متعلق کچھ جانتا ہو۔

ایک ہفتہ تھا میں بیمار تھا اور ابائے نیم شبی کی طرف کون لگا کر سننے اور ان کے اسرار معلوم کرنے میں مجھ کو میرے کانوں میں کواڑ لگنے لگتا تھا۔ کی آواز آتی تھی جس نے جا کر دروازہ کھولا تو سلیم کو سامنے کھڑا پایا۔ دُور

مجھے کپڑے پہنے ہوئے تھا اس کے بال اُلجھے ہوئے تھے اور اس کی پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی میں اس کی اچانک آمد سے بہت زیادہ مسرور ہوا۔ اسے اندر لایا۔ لیکن فقر و فاقہ کی علامات دیکھ کر مجھے کچھ تعجب ہوا ہانپا۔ میں اسے اپنے سامنے بٹھایا اور اس کے حالات دریافت کرنے لگا۔ اور جو سزا اس نے گھر اور اہل و عیال سے دُور رہ کر گزارا تھا اس کے ذائقہ پوچھنے لگا۔ وہ اپنی اُسی پُرانی عادت کے مطابق کبھی نو مبری آواز سے یکدم چونک اٹھتا اور کبھی بغیر کسی جواب کے میری طرف گھُور گھُور کر دیکھتا جیسے کہ وہ کچھ بھی نہ سمجھتا ہو۔

میں نے اسے شراب کا ایک پیالہ پلایا اور اس کو بتایا کہ میرے دل میں اس کی کتنی محبت ہے اور میں اسے کتنا آرام میں دیکھنا چاہتا ہوں پھر میں نے پوچھا! سلیم! تجھ پر کیا گُذر رہی تھی اپنے باپ سے ورنہ میں کتنی جاؤ ملی اور کتنا کیش مال ملا لیکن تُو نے وہ سب کچھ ضائع کر دیا۔
 کُرسی کے قریب رکھتے ہوئے بجلی کے بلب کی طرف ٹکلی لگائے ہوئے میرے سوال کا جواب، اس نے یوں دیا: تعجب ہے کہ تم مجھ سے کیوں اس قسم کے سوالات کرتے ہو؟ میں نے کوئی مال ضائع کیا اور نہ ہی کوئی

جاؤ! مجھے تو باپ سے جو کچھ ملا وہ اسی طرح باقی ہے۔ پھر مُسکراتے ہوئے
 کہا۔ ”مجھے کل وکيلوں اور وُترافوں نے بتایا کہ میرے والد کے مرتے ہی میری
 دولت دو گنی ہو گئی۔“

میں نے اُس کے لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مذاقاً کہا۔ اچھا
 تو تو اس لباس سے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے؟ تاکہ اگر لوگ
 تجھے دیکھیں تو اُن فقیروں میں سے سمجھیں جو لمبے لمبے عصاؤں کا سہارا لئے
 بغل میں کٹڑی کا بنا ہوا کُشکول دبائے شہر بہ شہر پھرتے ہیں۔“

اس نے جواب دیا۔ ”لوگوں میں تو ایسا کوئی بھی نہیں جو مجھیں بدل
 کر اپنے آپ کو دنیا کی نظروں سے چھپانے کی کوشش نہ کر رہا ہو اور ان
 میں ایسا بھی کوئی نہیں جو کوئی نہ کوئی چیز مانگتا نہ پھرتا ہو۔“

مجھے اس کی بات بہت پسند آئی اور کہا۔ ”ٹھیک ہے لیکن تو ایک
 معزز خاندان کا لال ہے کم از کم اپنے خاندان کی عزت کا تو خیال رکھ۔
 اور ایسے لباس میں لوگوں کے سامنے آجوتیرے اور تیرے خاندان کے
 شایانِ شان ہو۔“

وہ دھیمی آواز سے بولا۔ ”بھائی میں بہت زیادہ مصروف تھا اور ان

اُمور پر غور کرنے کیلئے میرے پاس کوئی وقت نہ تھا۔ یہیں ایک ایسے اہم کام میں لگا ہوا تھا جس کے سامنے عہدہ لباس اور اچھے خورد و نوش کے سامان کی مطاق وقعت نہ تھی۔“

اس وقت اس کے چہرے سے گرمی سوچ کے آثار دکھائی دینے لگے لیکن اس کے باوجود اس کی نظریں کجلی کے قمعے ہی پر لگی ہوئی تھیں۔
 میں نے پوچھا: سلیم تو کس کلام میں اتنا مصروف تھا۔ آخر وہ کونسا ایسا کام ہے جس کیلئے تو نے باقی تمام دنیا کو خیر باد کہا؟

وہ میری طرف متوجہ ہوا اور کہا: میں اپنے حافظے کے پردہ کو پھیلانے میں مصروف تھا۔ یہیں اپنے حافظے میں مدون خزانوں کو کھود کر نکالنے میں غور تھا۔ میں زمانے کی کتاب کے ان اوراق کو ایک ایک کر کے الٹ رہا تھا جس کا نام ہم نے حافظہ رکھا ہے۔“

اس کی زبان سے یہ کلمات اس طرح نکلے جس طرح خالی بیابان میں دُور سے تافلس کے جرس کی آواز کانوں میں پڑے۔ پھر اس نشاپتی آنکھیں مجھ سے پھیر لیں وہ پھر کجلی کی روشنی کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اپنی زندگی میں جیسے میں نے اسے دیکھا تھا مجھے یوں محسوس ہوا کہ اس کی

پابندِ مرض کے تار و راڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ اس کا اندرونی اضطراب
نہرے اطمینان کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ میں نے دوبارہ اس کے لئے شراب
کا پیالہ بھرا اور پھر اس سے پوچھا: "سیتم حافظے کے مذہب خزانوں سے اور
زندگی کی کتاب سے جس کو ہم حافظہ کہتے ہیں اتیری مُراہ کیا ہے؟ یہ جدید اور
عجیب خیال آخرت کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا: "میں نہیں جانتا کہ تو مجھے کہاں تک سمجھ سکتا ہے
یا کس حد تک مجھے سمجھنے کا ارادہ رکھتا ہے؟ میں خواہ مخواہ فضول ایسے
لوگوں کے سامنے اپنی دلی کیفیات بیان کرنے لگ جاتا ہوں جو روحانی دُنیا
سے منہ پھیرے بیٹھے ہیں۔ میں بیکار اپنی ذات کو ایسے لوگوں کے سامنے کھول
کر بیان کرنے لگ جاتا ہوں جو اپنی ذات کو بھی نہیں پہنچتے۔"

میں نے کہا: "سلیم! میں تجھے سمجھنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور اگر میں نے
دیکھا کریں تجھے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو اپنی کم مائیگی کا اعتراف
کر لو گا۔"

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا۔ پھر شراب کا ایک گونٹ پی کر کہنے لگا:
"اچھا تو سنو! لیکن دل کے کانوں سے سنو! تم نے کبھی یہ بھی

سوچا ہے کہ تم اپنی پیدائش سے پہلے کس حالت میں تھے؟
 میری روح اس سوال سے لوزاٹھی اور میں نے جواب دیا: ہاں! میں
 نے کئی مرتبہ اس مسئلہ پر غور کیا ہے لیکن ہر مرتبہ میری حالت اُس شخص کی طرح
 ہوتی تھی جو پرانے شاہ بلوط کے درخت کو جڑ سے اکھاڑنے کا ارادہ کر کے اسے
 ہاتھ لگاتے۔“

اُس نے کہا: ”کیا تُو نے کبھی دکھائی دینے والی چیزوں سے آنکھیں بند
 کیں؟ دنیا کی آوازیں سننے سے کانوں کو بند کرنے کی کوشش کی؟ زندگی
 کی سطحی چیزوں سے اپنے حواس کو خالی رکھا؟ ایسا کرنے سے اُس حالت کو یاد کیا
 جاسکتا ہے جو ہمارے انسان بننے سے پہلے تھی؟“
 میں نے کہا: ”نہیں! ایسا میں کبھی نہ کر سکا۔“

اُس نے کہا: ”میں نے ایسا کیا ہے۔ میں اپنی ذات کی گہرائیاں معلوم
 کرنے کی خاطر لوگوں سے دُور جا کر بیٹھا ہوں۔ میں نے ایسی حالت میں اپنے
 حافظے کی قوت سے اپنی بصیرت کے سامنے اُس وقت کے نشانات کھول
 کر رکھے جب مجھے فرشتے زمین پر نہیں لائے تھے۔“

میں نے کہا: ”اور کیا تُو اپنی مُراد تک رسائی حاصل کر سکا؟ کیا تُو نے

اپنے حافظے میں اس وجود سے پہلے وجود کے آثار پالئے؟
 اُس نے کہا: ہاں! میں نے اپنی مُراد کو پایا لیا۔ حافظہ زمانوں کی امانت گاہ
 ہے۔ ہمارا ہر ایک فرد اس بات پر قادر ہے کہ وہ اس امانت گاہ میں گھس کر
 اس کے گوشوں میں اور اس کی گہرائیوں میں زمانوں کے مدفون خزانوں کو دیکھے۔
 حافظہ ایک درخت ہے جس کے بیشمار پتے ہیں اور ہم دائمی نگر اور
 اپنے آپ کو رُوح کے سپرد کرنے کے ذریعے سے اس بات پر قادر ہو سکتے
 ہیں کہ ان اوراق کے گہر و سلسل جیکر لگائیں اور بالاخر یہ اوراق ہماری نظر و فکر
 کے سامنے اس طرح کھل جائیں جس طرح سورج کی شعاعیں منچے کے
 اندر پھیل کی نپچھڑیوں تک پہنچتی ہیں اور غنچہ اُن حرارت کی وجہ سے کھل کر
 پھول بن جاتا ہے۔

وہ تھوڑی دیر کیلئے خاموش رہا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل
 رہی تھی جو اس کی مسرت کی آئینہ دار تھی۔ اور پھر کہنے لگا: ”تم کئی سالوں سے
 مجھے مجذوب کہہ کر پکارتے رہے۔ تم میری حقیقت کی ترجمانی کر رہے تھے اور
 میری مانعہ اصلی حالت بیان کر رہے تھے۔ میں ہمیشہ اس ظاہری شکل و نمود
 کی نام نہاد دُنیا میں جھکتا رہا۔ دُنیا میں ایسا کون ہے۔ جس کی حیات معنوی

دو جھٹوں میں منقسم ہو۔ ایک حصے سے وہ عالمِ شیب کے حالات معلوم کرے اور
 دوسرے حصے سے مادی دُنیا کے گھمیلوں میں غیبیے اور پھر وہ کھویا ہوا نہ رہے
 کون ایسا انسان ہے کہ جب دو جذبے اس کی رُوح کو یک وقت اپنی اپنی
 طرف کھینچیں — پوشیدہ جذبہ اور ظاہری جذبہ — اور پھر وہ آہ آہ نہ
 کرے! کون ایسا انسان ہے جو اپنے کانوں میں دو مختلف آوازوں کو جگہ
 دے جن میں سے ایک آواز — فضا سے آسمانی سے آتی ہوئی آواز —
 اس کی رُوح کو مسرور رکھنے کی کوشش کرتی ہو اور دوسری آواز — زمین
 کے اندر سے نکلتی ہوئی آواز — اسے نفرت دلاتی رہتی ہو! — ہاں
 میں مجذوب تھا اور مجذوب رہا لیکن اس وقت میں وہ کچھ جانتا ہوں جو میں اپنے
 عالمِ شباب میں نہیں جانتا تھا۔ میں تین سال تک اپنے حافظہ کی کھیتی میں بھرتا
 رہا اور میں نے سب کچھ حفظ کر لیا۔ میں نے معلوم کر لیا کہ اس وجود سے پہلے میں
 کیا تھا۔ میں نے جان لیا کہ اس وجود سے پہلے میں کیسے تھا۔ میں نے معلوم کر لیا
 کہ ماں کے پیٹ سے نکلنے سے قبل میری نفسی حالت کیا تھی۔ مجھ پر ظاہر ہو گیا
 کہ میری رُوح کی حقیقت موجودہ جسم کا عارف اور غرض سے پہلے کیا تھی۔ میں نے
 اپنے سرخسے کو پایا اور اب میں مطمئن ہوں اس لئے کہ اسی حافظے میں وہ جی

مزاج کو بتائیگا۔

اس نے اپنا سر جھکا کر آنکھیں بند کر لیں اس کا کمزور چہرہ کسی ماہر
منگ تراش کا بنایا ہوا ماتمی دانت کا ماڈل نظر آنے لگا جو نصرانیت کے
شہداء میں سے کسی شہید کے چہرہ کی یاد دلانے کے لئے تراشا گیا ہو۔ میں اس
کی گہری کے قریب گیا اور اس خیال سے کہ میری آواز سے اس کے خیالات
کا تسلسل نہ ٹوٹ جائے میں نے نہایت دھیمی آواز سے اسے مخاطب کر کے
کہا: "سلیم! خدا کیلئے مجھے وہ سب کچھ بتا دے جو تو نے حاصل کیا ہے۔ میں
پوری توجہ سے تیرا ایک ایک لفظ سن رہا ہوں۔"

اس نے سر اٹھایا اور آنکھیں کھولے بغیر ہی اس نے جواب دیا: "یاد
رکھو کہ میں فضا میں اڑ رہا تھا۔ اچھی طرح سمجھ لو کہ میں خلا میں پرواز کر رہا تھا
میں کبھی مبلندی کی طرف چڑھتا تھا اور کبھی نیچے اترتا تھا میں کبھی ہوا کے ساتھ
دوڑتا اور اگر چاہتا تو ٹھہرتا تھا لیکن اپنے متعلق ہی سمجھتا تھا کہ میں ایک
وقت میں ہر جگہ ٹھہر اور تمام اوقات میں ایک مقام پر ہوں میں سورج
کی کرنوں میں تباہی نہیں بلکہ میں خود ان کرنوں میں سے ایک کرن کی حیثیت
رکھتا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ میں اُرتے ہوئے غبار کا ایک ذرہ تھا کہ

غبار کا مجسمہ۔ میں نہیں جانتا کہ میں زندگی کے میلانات کا ایک
جُڑ تھا یا زندگی کے تمام میلانات کا سرشمہ تھا۔ میں اپنے متعلق کتا کہیں
میں ہوں، لیکن اس وقت میں کے لفظ سے مراد جسم نہ تھا جو صرف چند خطوط
میں گھرا ہوا ہے، وہ ایک خاص رنگ رکھتا ہے اور اس کی کچھ خصوصی علامات
ہیں۔ نہیں۔ میں ایک فرد نہ تھا۔ میں ایک ذرہ نہ تھا۔ میں ایک جزو
نہ تھا۔ نہ ہی میں چاروں عناصر میں سے کوئی ایک خاص عنصر تھا۔ بلکہ میں تو تمام
عناصر کا ایک مجموعہ تھا۔ جو مل کر ایک فرد کی حیثیت میں ظاہر ہو رہے تھے۔ میں
اس کی تعریف اس کے علاوہ کسی اور طرح کرنے کے قابل نہیں کر رہا تھا۔ میں
تھا۔ میں اپنے ماضی میں ہی تھا۔ میں نے ماضی کا لفظ کہہ تو دیا مگر
میں اس کے مکمل معنی اب بھی نہیں سمجھتا۔ کبھی ماضی حال اور استقبال
کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے اور کبھی تو ماضی حال اور استقبال کچھ بھی نہیں
پایا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم جسے زمانہ کہتے ہیں میں اس کو سمجھ ہی نہ سکا۔
اور اسی طرح میں مکان کا مطلب سمجھنے سے بھی قاصر ہوں۔ جب میں
ان دونوں نظموں — زمانہ و مکان — کے متعلق دریافت کرنے لگا ہوں
تو میں بڑی مشکل میں اپنے آپ کو پاتا ہوں۔ یہاں تک کہ خود اپنی ذات کا

علم مجھے نہیں بتاتا میری عقل اس وقت ایک کثیف دھند کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو ٹیلوں اور گھائیوں میں بھٹکتی پھرتی ہے۔ لیکن جہاں تک میں اچھی طرح سمجھا ہوں وہ یہی ہے کہ ہم ایک حالت میں تھے اور پھر دوسری حالت میں آ گئے ہیں معزز تھا ذلیل ہو گیا۔ میرے اندر وسعت تھی وہ ایک محدود دائرے میں گھبر گئی میری ابتدا و انتہا کی کوئی حد نہ تھی وہ محدود ہو گئی۔ میں ایک مضبوط ارادے کا حامل تھا اور اپنے نفس کو اچھی طرح پہچانتا تھا اور پھر کمزور ہو کر معرفتِ نفس کی آرزوئیں کرنے لگا۔ میں صبح تھی جو ہر سطح پر اُڑتی اور ہر پردے کو پھاڑ کر اندر داخل ہوتی۔ پھر میں جسم کی حالت میں بدل گیا جو بہت سُستی سے اُٹھنا اور اپنے اعضا کو بجاری زنجیروں کی طرح کھینچنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں تھا اور میں ہو گیا۔ میں تھا اور میں ہو گیا۔ میں یہی کلمات دہراتا رہا۔ یہاں تک کہ میں اپنے وجدان کے دونوں سروں تک پہنچ گیا۔

بیس سال سے میں اپنی عقل سے یہی دریافت کر رہا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ میں اس تبدیلی کی حقیقت اور اس انقلاب کی کیفیت کو پوری طرح معلوم کر سکوں لیکن مجھے پوری کامیابی نہ ہوئی اور میرا خیال ہے کہ پوری

کامیابی کبھی حاصل نہ ہوگی۔۔۔۔۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ میں ایک ہی وقت
 میں صاف و صریح بات کو اور نہایت ہی باریک نکلتے کو یاد رکھ سکتا ہوں
 — مجھے یاد ہے کہ اس وقت جب میں ایتھر کی شکل میں تھا مجھے ایک
 ہولناک حادثہ پیش آیا۔ میرے داخلی محیط میں اس عالم میں جسے میں میں تو
 میں ہی ہوں پکار رہا تھا یہ حادثہ رونما ہوا جسے میں دھماکا کہہ سکتا ہوں اور
 اور تمام عالم سارے کا سارا ہندسی بن کر جوش مارنے لگا اور اس سے جھاگ
 نکلی شروع ہوئی پھر ہڈیاں میں ہیجان آیا اور اس سے ایک بروست آندھی پیدا
 ہوئی جس نے اپنے زور سے میرے عالم کے ہر ساکن ذرہ کو اڑایا۔ میرا مالک اور
 میرا ملوک سکین یکایک ایک مہیب اور خطرناک گرج میں تبدیل ہو گیا
 گھبراہٹ جس سماہتی کے ساتھ میرا محلقہ ہوا کرتا تھا ایک بجلی بن گئی اور دھ
 غیر محدود محضت جو ہر چیز کو اپنے احاطہ میں لے کر اس کے اسرار اور دقائق
 کو معلوم کیا کرتی تھی یکایک چند در چند تشویشوں میں بدل گئی اور وہ عالم بالا
 کی وہ خاموشی جو میری گہرائیوں میں ساکن تھی ان گنت درو کی ماری ہوئی
 عورتوں کی چھنیاں لاکھیاں بھیر کے شیروں کی دھاڑیں اور بے شمار جرسوں
 کی آوازیں نکالنے لگی۔ یہ شور و شر معلوم نہیں کتنی مدت جاری رہا۔ ایک منٹ

یا پورا زمانہ پھر حرکت ساکن ہو گئی۔ ہر آواز خاموش اور ہر تشویش ختم ہو گئی
 میں اب ساکن تھا۔ اُس شخص کی طرح جسے ہر طرف سے دیا گیا ہو محسوس
 ہی عرصہ میں دباؤ اور تنگی کے باوجود میں خاموشی سے تامل فرما رہا تھا۔ پھر میں نے
 ایک نہایت ہی بھل اور غالب نیند کا احساس کیا اور گہری تاریکیوں میں جا کر
 گہری نیند سو گیا۔

ستیم باتوں سے رُک گیا۔ اس کے چہرے سے نھکان کے آثار ظاہر ہونے
 لگے۔ اُس نے اپنا سر کُرسی کی پشت پر ڈال دیا۔ وہ ایسے ہنپ رہا تھا جیسے
 گھوڑا گھوڑ دوڑ کے بعد مانس لیا کرتا ہے پھر اُس نے مجھے ایسی آنکھیں سے دیکھا
 جن سے لطیف شعا عین نکل رہی تھیں اور کہا۔ اُس کے بعد اس طوفان اور
 اس سکون کے بعد اس گراں خرابی اور گہری نیند کے بعد میں بیدار تو ہوا لیکن
 اس مدہوش کی طرح جس کے وجدان پر غفلت کے پردے پڑے ہوں۔ میر
 نے اپنے آپ کو ایک عورت کے ہاتھوں میں ایک بے بس تجر کی شکل میں پایا۔
 میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پیارا اور محبت سے مسکرا رہی تھی۔
 میں سمجھ گیا کہ اس کے آسمانی سفر نے اس کی روح اور اس کے جسم کو
 تھکا دیا ہے اس لئے میں نے کہا۔ بھائی! بس اتنا کافی ہے۔ مجھے تم نے

ان اسرار سے آگاہ کیا جو تم سے پہلے کسی انسان نے مجھے نہیں بتائے۔ اس وقت تمہیں مزید آرام اور اطمینان کی ضرورت ہے۔ اس لئے اس سے آگے اس وقت کچھ نہ کہو۔

اس نے کہا: اس کے بعد میرے پاس کہنے کی کوئی بات ہے بھی نہیں میں نے تمام وہ باتیں جو مجھے یاد تھیں اور جن کو میں حاصل کر سکا تھا، یہ سب سنے بیان کر دیں لیکن میں اب تک اپنی مسلمات اور اپنی یاد کی باتوں میں گم ہوں میں ہمیشہ ضائع ہوں ہمیشہ ضائع۔

تھوڑی دیر اسی طرح بالکل خاموشی رہی۔ مجھے وہ تھوڑا سا وقت اور اس کی تاثیر زندگی بھر یاد رہیں گے میں نے اپنے نفس میں ایک بالکل نیا احساس پایا میں نے اپنے دل پر شراب کے نشے کا اثر محسوس کیا اور میری تفکرات۔ اے خدا! اس پہنا۔

جب رات آدمی گزر گئی۔ سلیم یہ کہتے ہوئے اٹھا۔ ہم بہت دیر تک جاگتے رہے اب میں جاتا ہوں۔

میں نے کہا: بھائی! ابھی نہ جاؤ۔ آج کی رات میرے مکان رہو۔ اس نے جواب دیا: نہیں! میں ایسے مکان میں زیادہ نہیں ٹھہر سکتا

جس کی فضا میں آوازیں ترش نظر آتی ہوں اور اس کے گوشوں میں سائے
گھومتے ہوئے نظر آتے ہوں میرے لئے فردوسی ہے کہ کسی خالی اور پرستو
مقام کی تلاش کر دوں۔

وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہو اور دوازے کی طرف بڑھا اور یوں بھاگتے
ہوئے نکلا جس طرح جلتے ہوئے مکان سے کوئی جان بچانے کی خاطر بھاگتا ہے

اس وقت سے لے کر اب تک مجھے جب بھی سلیم یاد آتا ہے میرا ہنک
زمنے کو لیل و نہار میں تقسیم کرنے والے ہر سہیلے سے پھر جانتا ہے اور جب
کبھی اس کی بات یاد آتی ہے تو میں ان سارے امتیازات سے ہٹ جاتا ہوں
جو زمانے کو دائیں بائیں میں تقسیم کر دیں میں جب اُس کا چہرہ دیکھتا ہوں اور اس کی آواز
کو یاد کرتا ہوں تو میری سمجھ وجود کے ظاہری اشکال اور باطنی آواز کا مقابلہ کرنے
میں گم ہو جاتی ہے۔

ہاں میں نے سلیم کی طرح کا آدمی نہ کبھی دیکھا ہے اور نہ کبھی ملیگا۔ وہ لوگوں
میں رہتا ہے مگر ان میں شمار نہیں۔ وہ دنیا میں ہے مگر یہاں کارہننے والا نہیں
بسا اوقات میں دل میں یہ سوچتا ہوں کہ میں اُس سے اس کمرے میں ایک گھنٹہ

ان اسرار سے آگاہ کیا جو تم سے پہلے کسی انسان نے مجھے نہیں بتائے۔ اس وقت تمہیں مزید آرام اور اطمینان کی ضرورت ہے۔ اس لئے اس سے آگے اس وقت کچھ نہ کہو۔

اس نے کہا: اس کے بعد میرے پاس کہنے کی کوئی بات ہے بھی نہیں میں نے تمام وہ باتیں جو مجھے یاد تھیں اور جن کو میں حاصل کر سکا تھا۔ ہمہ سٹے بیان کر دیں لیکن میں اب تک اپنی مسلمات اور اپنی یاد کی ہوتی باتوں میں گم ہوں میں ہمیشہ ضائع ہوں ہمیشہ ضائع۔

تھوڑی دیر اسی طرح بالکس خاموشی رہی۔ مجھے وہ تھوڑا سا وقت اور اس کی تاثیر زندگی بھر یاد رہیں گے میں نے اپنے نفس میں ایک بالکل نیا احساس پایا میں نے اپنے دل پر شراب کے نشے کا اثر محسوس کیا اور کبیر تفکرات۔ ایہ سہا ایس پہنا۔

جب رات آدمی گزر گئی۔ سلیم یہ کہتے ہوئے اٹھا۔ ہم بہت دیر تک جاگتے رہے اب میں جاتا ہوں۔

میں نے کہا: بھائی۔ ابھی نہ جاؤ۔ آج کی رات میرے مکان رہو۔ اس نے جواب دیا: نہیں! میں ایسے مکان میں زیادہ نہیں ٹھہر سکتا

جس کی فضا میں آوازیں متعش نظر آتی ہوں اور اس کے گوشوں میں سائے
گھومتے ہوئے نظر آتے ہوں۔ میرے لئے ضروری ہے کہ کسی خالی اور پُر سکون
مقام کی تلاش کروں۔“

وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا اور یوں بھاگتے
ہوئے نکلا جس طرح چلتے ہوئے مکان سے کوئی جان بچانے کی خاطر بھاگتا ہے،

اس وقت سے لے کر اب تک مجھے جب بھی تسلیم یاد آتا ہے۔ میرا فکر
زندگی کو سبیل و نہار میں تقسیم کرنے والے ہر بچانے سے بچر جاتا ہے اور جب
کبھی اس کی بات یاد آتی ہے تو میں ان سارے امتیازات سے ہٹ جاتا ہوں
جو زمانے کو دہائیں بائیں میں تقسیم کر دیں ہیں جب اُس کا چہرہ، اور اس کی آواز
کو یاد کرتا ہوں تو میری سمجھ وجود کے ظاہری اشکال اور باطنی آواز کا مقابلہ کرنے
میں کم ہو جاتی ہے۔

ہاں میں نے تسلیم کی طرح کا آدمی نہ کبھی دیکھا ہے اور نہ کبھی ملیگا۔ وہ لوگوں
میں رہتا ہے مگر ان میں شمار نہیں۔ وہ دنیا میں ہے مگر یہاں کارہنہ والا نہیں
بسا اوقات میں دل میں یہ سوچتا ہوں کہ میں اُس سے اس کمرے میں ایک گھنٹہ

دو گھنٹہ کے لئے ملا تھا یا میں نے اس کے ساتھ فضا میں ایک طویل زمانہ گزارا ہے۔ میں اپنے حافظہ پر زور دے کر یاد کرتا ہوں کہ میں نے اسے خواب میں دیکھا تھا یا بیداری میں۔ اس کا فیصلہ میں صرف اس ایک دلیل سے کر سکتا ہوں کہ نادر حقائق بیداری ہی میں ظاہر ہوتے ہیں اور تسلیم بھی ایک نادر حقیقت ہی ہے۔

Much fine, most excellent.
 Long live to his principles.
 His earthly body was
 buried, not his thoughts
 not his doctrines and he
 is Khalil Gibran.

چند سوالات

(۱) عربی زبان کا مستقبل کیا ہے؟

ادب پوری قوم اور اس کی ہنیت کلی میں قوتِ تجدید کے آثار میں سے ایک نشانی ہے۔ جب تجدید کی قوت کمزور ہو جائیگی تو ادب بھی اس کے ساتھ ہی اپنے مقام پر ٹھہر جائیگا۔ ٹھہرنے کے ساتھ ہی اس میں رجعت پیدا ہوگی اور رجعت کے ساتھ اس کی موت اور اس کا مٹ جانا ضروری اور لازمی ہے۔

اس لئے عربی ادب کے مستقبل کا دار مدار عربی بولنے والی قوموں

کے اندر مجددانہ فکر کے وجود و عدم پر یہ قوتِ حرکت اور اگر یہ فکر موجود ہے تو ادب عربی کا مستقبل اپنے ماضی کی طرح شاندار ہے اور اگر یہ فکر موجود نہیں تو اس کا مستقبل بھی سرانی اور عبرانی سے زیادہ شاندار نہیں رہے گا۔

اور یہ قوتِ تجدید کس چیز کا نام ہے؟

یہ قوم کے اندر ایسے جذبے کا نام ہے جو اسے آگے کی طرف دھکیلتا ہو۔ وہ اس کے دل میں بھوکِ پیاس اور غیر معلوم چیز کو حاصل کرنے کے شوق کا دوسرا نام ہے۔ یہ اس کی روح کو کشش آنے والی خواہشوں کے ایک سلسلے کا نام ہے جس کی جستجو میں وہ دن رات لگا ہوا ہو لیکن وہ جب بھی اس مسلسل زنجیر کی ایک کڑی کھولتا ہے۔ حیاتِ زنجیر کی دوسری طرف ایک اور کڑی لگا دیتی ہے یہ افراد میں برتری اور قوم میں شجاعت کا نام ہے اور افراد میں برتری کے معنی یہی ہیں کہ وہ جماعت کے مخفی احساسات کو ظاہری اور محسوس شکل دینے کی قدرت رکھیں۔ اسی وجہ سے جاہلیتِ عرب کے ایام میں عرب کا شاعر بھی تیاری میں مشغول تھا۔ اس لئے کہ پوری قوم تیاری میں مشغول تھی اور محضرین کے نامہ میں شاعر بڑھ رہا تھا اور پھیل رہا تھا اس لئے کہ یہ زمانہ قوم کے بڑھنے اور پھیلنے کا تھا اور مولدین کے زلمے کا شاعر

فنونِ شعر کے شعبوں میں تقسیم ہو رہا تھا۔ اس لئے کہ اس وقت امتِ اسلام میں فرقہ
 میں منقسم ہو رہی تھی۔ اس طرح شاعر ہمیشہ کبھی چلتا کبھی پڑھتا اور نئے نئے رنگ
 بدلتا رہا ہے کبھی وہ فلسفی کے لباس میں ظاہر ہوتا کبھی وہ طبیب بن جاتا ہے
 اور کسی وقت وہ آسمانوں کی باتیں کرنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ جب قوم عرب
 کی بیداری پر نیند کا خمار چھانے لگا اور آخر وہ سو ہی گئیں تو شاعری تک بند
 تک محدود ہو گئی۔ فلسفی علم کا کام کے مباحث میں الجھ کر رہ گئے۔ طبیبوں نے
 جیلہ سازیوں اختیار کیں اور مہبت دان نجومی بن کر رہ گئے۔

ان واقعات پر نظر ڈالنے کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے
 کہ عربی ادب کا مستقبل ان قوموں کی قوتِ بیداری کے ساتھ وابستہ ہے جو
 عربی بولتی ہیں۔ اگر یہ تمام اقوام ایک ہی وحدت کی قائل ہیں اور اس وحدت
 اجتماعی میں لمبی نیند کے بعد بیداری کے آثار ظاہر ہونے لگے ہیں تو سمجھ جاؤ کہ
 ادب عربی کا مستقبل شاندار ہے اور اگر ایسا نہیں تو عربی ادب کا مستقبل
 تار یک ہی رہیگا۔

(۲) سوال :- یورپی نندن اور مغربی روح کا اثر عربی ادب پر کیا

ہوگا ؟

ادب تو ایک قسم کی غذا ہے جس کو زبان باہر سے خوب چبا کر نگھلتی ہے اور اس کے مفید حصہ کو اپنی زندہ ہئیت کا جزو بناتی ہے۔ عینہ وہی عمل جو درخت کو روشنی، ہوا اور مٹی کے ساتھ کرنا پڑتا ہے اور جس کے بعد یہ لہزا ٹھنسیوں، پتوں، کلیوں اور پھلوں میں تبدیل ہوتے ہیں۔ اگر ادب کے پاس چبانے کے لئے دانت اور مضغ کرنے کے لئے معدہ ہی نہ ہو تو غذا کی تاثیر نہ صرف بیکار بلکہ زہر سے بھی زیادہ مُضر ثابت ہو سکتی ہے۔ کیا آپ نے ایسے پودے نہیں دیکھے جو سایہ میں کچھ نہ کچھ سرسبز رہیں و شادابی رکھتے ہیں لیکن سورج کی روشنی میں آتے ہی مڑھکا کر ختم ہو جاتے ہیں مشہور ضرب المثل ہے ”کر سراپہ دار کا سراپا یہ بڑھتا رہتا ہے مگر مفلس آدمی اپنا بچا کھچا بھی کھودیتا ہے“

مغربی رُوح تو انسان کے مختلف ادوار میں سے ایک و دوار اور اس کی زندگی کا ایک حصہ ہے۔ انسانی زندگی ایک تیز رفتاری سے گزرتی ہے۔ انسان کی طرف دوڑتی چلی جاتی ہے۔ اس کے ارد گرد پیدا ہو کر اڑنے والی ننھی گروسے مختلف حکومتیں، مختلف زبانیں اور مختلف مذاہب بنتے ہیں اس قافلہ کے آگے آگے جانے والی قوم ایک بیدار قوم ہوا کرتی ہے اور یہی قوم دامنِ مَوْت نہ ہوا کرتی ہے۔ ان کے پیچھے پیچھے جانے والی تمام قومیں مقلد

ہوتی ہیں اور اس قوم کا اثر قبول کر لیا کرتی ہیں جس وقت تک مشرقی اقوام اگے آگے تھیں اور مغرب کی قومیں ان کے نقش قدم پر چل رہی تھیں اُس وقت ہمارا تمدن اور ہمارا ادب ان پر اثر انداز رہا لیکن اب وہ ہم سے آگے بڑھ گئے ہیں اور ہمیں انہیں نے پیچھے چھوڑ دیا ہے اس لئے بالکل قدرتی طور پر ان کے تمدن، ان کے ادب، ان کے اخلاق و افکار کا اثر ہماری زندگی کے ہر شعبے پر پڑ بیگا۔

فرق یہ ہے کہ پہلے دور میں مغرب کی قومیں ہماری تیار کی ہوئی غذا

ہم سے لے کر باقاعدہ چبا چبا کر کھا لیا کرتی تھیں اور اس کے مفید اجزاء کو اپنے

مغربی رنگ میں رنگ لیتی تھیں لیکن ہم مشرقی اقوام اس وقت مغرب

سے حاصل کی ہوئی غذا کی تاثیر نکل رہے ہیں اور اس کو ہضم نہیں کر

سکتے جس کا اثر یہ ہو رہا ہے کہ اس مفید چیز کو مشرقی رنگ میں رنگنے کی بجائے

ہم مغربی بننے لگے ہیں۔ ایسی غارک حالت سے مجھے خوف ہوتا ہے اور میں

اس سے بچنے کی فکر کر رہا ہوں۔ مجھے مشرق کی یہ حالت دیکھ کر ایسا نظر آتا ہے

کہ مشرق یا تو ایک ضعیف العمر انسان ہے جس کے سارے دانت گر گئے

ہوں اور یادہ شیرخوار بچہ جس کا کوئی دانت نکلا ہی نہیں۔

بالحمد لله
الذي هدانا لهذا
ما كنا لنهتدي لولا
هدى الله لنا
فإننا كنا لنكون
من الخاسرين

مغربی رُوح ہماری دوست ہے بشرطیکہ ہم اس پر قابو پالیں اور ہماری دشمن ہے اگر وہ ہم پر قابو پالے۔ دوست ہے اگر ہم اس کے لئے اپنے دل کھول دیں لیکن دشمن ہے اگر ہم اپنے قلوب بالکل اس کے حوالے کر دیں۔ وہ ہے اگر ہم صرف وہ چیزیں اس سے حاصل کریں جو ہمارے حالات کے موافق ہوں اور دشمن ہے اگر ہم اپنے آپ کو اس کے حالات میں ڈھال لیں۔

(۳) موجودہ سیاسی انقلاب کا اثر ممالک عربیہ پر کیا پڑے گا؟
مغرب اور مشرق کے تمام مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ ممالک عربیہ کی سیاسی، اجتماعی اور نفسیاتی حالت تشویش ناک ہے اور اکثر کا یہ خیال ہے کہ یہ تشویش بالآخر قوم کو تباہ اور نیست و نابود کر دیگی۔

لیکن میں پوچھتا ہوں کہ یہ تشویش ہے یا اکتاہٹ یا تھکان؟
اگر تھکان ہے تو تھکان پر اُمت کی انتہا اور ہر فرقے کا خاتمہ ہوتا ہے
تھکان موت ہی کا دوسرا نام ہے جو نیند کی شکل میں ظاہر ہو۔

لیکن اگر حقیقت میں صرف تشویش ہی ہے تو پھر میرے خیال میں تشویش کا انجام ہمیشہ اچھا ہی ہوا کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی وجہ سے قوم کی رُوح میں لُٹ شیڈ ادا دے ظاہر ہو جائے گا۔ اس کا نشہ اسی کے اثر سے

نازل ہو جایا کرتا ہے اور وہ نیند سے بیدار ہو جایا کرتی ہے۔ تشویش تیز ہواؤ
 کی مانند ہے جو درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ کر نہیں پھینکتی بلکہ اس کی خشک
 شاخوں کو توڑ کر پھینک دیتی ہے اور خزاں زرد زرد پتوں کو چھانٹ دیا کرتی
 ہے۔ تشویش جب ایسی قوم میں ظاہر ہو جاتے جس کے فطری جذبات ابھی باقی
 ہوں تو یہ اس امر کی علامت ہوتی ہے کہ ان کے افراد میں بیداری اور ان کی
 اجتماعی روح میں استعداد موجود ہے۔ سیدم زندگی کی کتاب کا پہلا لفظ ہے
 آخری نہیں۔

اس لئے میرا خیال ہے کہ موجودہ سیاسی انقلاب ممالک عربیہ کی
 تشویش کو ایک نظام میں بدل دیگا۔ اس کے اندرونی رموز و اشکال کو ترتیب
 دے کر باہم ملا دیگا۔ لیکن یہ انقلاب اس کی مایوسی کو وجد میں اور اس کی تھکان
 کو شجاعت میں نہیں بدل سکتا۔ کملا مٹی سے شراب کیلئے برتن اور سر کے کیلئے
 لٹا تو بنا سکتا ہے لیکن کنکروں سے یاربت سے وہ کوئی برتن تیار نہیں
 کر سکتا۔

(م) کیا عربی زبان مدارس عالیہ اور ابتدائی مدارس میں عام ہو جائیگی

اور اسی میں تمام علوم پڑھاتے جائیں گے؟
 لے السیدم۔ نورانی لا۔ ماہ کی چھٹی ہفتی جو چھٹا نکلا کر منجم ہو جائے۔

جب تک یہ تمام مدارس ایک ہی وطنی رنگ اختیار نہیں کرینگے اس وقت تک عربی زبان ان میں عام نہیں ہو سکتی۔ اور اس زبان میں تمام علوم اس وقت تک نہیں پڑھائے جائیں گے جب تک کہ تمام مدارس کا انتظام خیراتی انجمنوں، فرقہ دار جماعتوں اور فریبی اداروں کے ہاتھوں سے چھین کر لوکل گورنمنٹوں کے ہاتھ میں نہ دیا جائے۔ مثال کے طور پر شام میں ہمارے پاس تعلیم ایک مدت کی شکل میں مغرب سے آئی تھی۔ ہم چونکہ بھوکے تھے اس لئے یہ معدنے کی تعلیم جلدی سے نکل جایا کرتے تھے۔ اسی غذائے ہمیں زندہ نہ کر دیا لیکن زندہ کرنے کے ساتھ ہی بے جان بھی کر دیا۔ ہمیں زندہ کر دیا اس سے کہ اس کی وجہ سے ہمارے بعض احساسات جاگ اُٹھے اور عقلمیں محفوری سی جیاد ہوئیں اور ہمیں بے جان یوں کیا کہ ہماری آواز کو منتشر کر دیا۔ ہماری وحدت کو کمزور کر دیا۔ ہمارے تعلقات کو آپس میں منقطع کر دیا اور ہمارے فرقوں کو ایک دوسرے سے بہت دور پھینک دیا یہاں تک کہ ہمارا وطن عربیہ چھوٹی چھوٹی نوآبادیوں میں بدل گیا جن کے ذوق اور جن کے مشرب ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ہماری ہر نوآبادی جدا جدا مغربی طاقت سے وابستہ ہے اور اسی کا حصہ اسرہلند کئے ہوئے کھڑی ہے اور اسی کے گن گانے میں

مصرف ہے۔ ہمارا جو نوجوان امریکہ کی کسی درسگاہ کا تعلیم یافتہ ہے وہ طبعی طور پر امریکن طرز معاشرت کا دلدادہ ہے۔ دوسرا نوجوان جس نے عیسائی درسگاہ کی گود میں کچھ حاصل کیا وہ فرانس کا سفیر بنا بیٹھا ہے۔ وہ نوجوان جس نے روس کی کسی درسگاہ کا یونیفارم پہنا ہے وہ روس کے رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا ہے۔ غرض کہ جتنی درسگاہیں مغرب میں نظر آتی ہیں ان کے الگ الگ رنگ ہمیں اپنے چھوٹے سے وطن میں نظر آ رہے ہیں۔ میرے اس دعویٰ کی بڑی دلیل وہ سیاسی نظریے ہیں جو موجودہ دور میں شام کے سیاسی مستقبل کے متعلق مختلف شکلوں میں ظاہر ہو رہے ہیں جن لوگوں نے انگریزی زبان کے ذریعے کچھ حاصل کیا ہے وہ چاہتے ہیں کہ امریکہ اور برطانیہ ہمارا نگران ہو جنہوں نے فرانسیسی زبان کے ذریعے کچھ حاصل کیا ہے وہ فرانس کی سیادت کو ترجیح دیتے ہیں اور جنہوں نے ان دونوں زبانوں میں سے کسی زبان کے ذریعے کچھ حاصل نہیں کیا ہے اپنی عقل کی رسائی کے مطابق اپنی ہی سیاست کو ترجیح دیتے ہیں اور ان دونوں طاقتوں میں کسی کی پناہ میں آنا پسند نہیں کرتے۔

سمجھی ہمارا سیاسی میلان اس گروم کی طرف ہوتا ہے جس کے خسرے

ہم تعلیم حاصل کرتے ہیں اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مشرق کے رہنے والے احسان کے قدر شناس ہیں لیکن آخر یہ کونسی محو نیت ہے جو ایک چھتر کو ایک طرف سے رکھتی ہے اور دوسری طرف سے پوری دیوار کو گراتی جاتی ہے۔ یہ کونسا جذبہ ہے جو ایک پودا اگانا ہے اور پورے گلشن کو دوسری طرف سے کاٹتا ہے۔ یہ کونسی نمک حلائی ہے جو ہیں ایک دن کیلئے تو زندہ کرتی ہے لیکن دائمی موت کی نیند سلا دیتی ہے؟

مغرب کے تحقیقی محسنوں نے ہماری اس غذا میں جہانوں نے ہم تک پہنچانے کی کوشش کی کانٹے نہیں ملائے۔ انہوں نے ہمیں نفع پہنچانے کا ارادہ کیا تھا ہمیں نقصان پہنچانے کا نہیں۔ لیکن پھر کانٹے کہاں سے آئے اور یہ گھوکرو کہاں سے اس میں مل گئے۔ یہ ایک الگ سوال ہے جس کے متعلق میں یہاں کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا۔

ہاں عنقریب جب عربی زبان ابتدائی و انتہائی مدارس میں لانج رہی اور تمام علوم کے پڑھانے کا ذریعہ یہی زبان ہوگی تو اس وقت ہلکے سیاسی میلانات میں اتحاد پیدا ہوگا اور فوجی تفرقات ختم ہو کر رہ جائیں گے اس لئے کہ مدرسہ ہی وہ مقام ہے جہاں مختلف میلانات یکجا ہو جاتے ہیں اور تفرقات

ختم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اُس وقت تک نہیں ہوگا جب تک قوم کے بچے قوم ہی کے خرچ پر تعلیم حاصل نہ کریں۔ یہ اُس وقت تک نہیں ہوگا جب تک کہ ہمارا ہر ایک فرد ایک ہی وطن کا فرزند نہ ہو، ایسا نہ ہو کہ ایک ہی انسان اپنے ظاہری جسم کے اعتبار سے ایک وطن کا فرزند ہو اور اس کی رُوح کسی دوسرے ایسے ملک کے گُن گار ہی ہو جو پہلے وطن سے بالکل مختلف ہے یہ اُس وقت تک نہیں ہوگا جب تک ہم صدقہ سے حاصل کی ہوئی غذا کو ایسی غذا میں تبدیل نہ کر دیں جو ہمارے ہی گھر کی تیار کردہ ہو۔ اس لئے کہ ایک مخرج فقیر کی طاقت سے یہ باہر ہے کہ وہ صدقہ دینے والے کو کسی شرط کا پابند نہ دے جو شخص صدقہ لے کر اپنا نفس ذلیل کر لیتا ہے وہ صدقہ دینے والے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ محتاج ہمیشہ دوسروں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے اور دیا تو ہمیشہ صاحب اختیار ہوتا ہے۔ +

(۶) کیا فصیح عربی باقی تمام مختلف عام لہجوں پر غالب آجائی اور

عربی زبان بالکل ایک ہو جائیگی؟

عام لہجے بدلتے رہتے ہیں اور مہذب ہونے ہیں۔ رخت لہجے استعمال میں آتے آتے نرم ہو جاتے ہیں لیکن وہ مغلوب کبھی نہیں ہوتے اور چاہئے

بھی یہی کہ وہ مغلوب نہ ہوں۔ اس لئے کہ یہی عام لہجے ہی تو فصیح زبان کا اصل منبع ہیں اور یہی تو ترقی یافتہ ادب کا سرچشمہ ہیں۔

دنیا کی سرچیز کی طرح زبانوں میں بھی بقائے نسب (Survival)

(of the fittest) کا قانون جاری ہے اور عامیانا لہجوں میں بھی نسب (Fittest) کا کافی ذخیرہ موجود ہے جس کا باقی رہنا ضروری ہے کیونکہ وہ قوم کے ذہن اور اس ہیئت و جدائی کے مقاصد میں زیادہ کارآمد ہیں۔ اس ذخیرہ کے باقی رہنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ یہ ادب کے جسم میں گھل مل کر اس کے اجزائیں شمار ہو جائیگا۔

مغربی اقوام کی تمام زبانوں کے عامیانا لہجے موجود ہیں۔ یہ عامیانا لہجے ایسے ادب اور فن کے آئینہ دار ہیں جو پسندیدہ خصوصیات اور ترقی پسند جدت کا مجموعہ ہیں۔ بلکہ یورپ اور امریکہ میں ایسے نظری شاعر بھی موجود ہیں جو عامیانا لہجوں کو فصیح زبان کے ساتھ ملا کر قصائد اور مستزسات بناتے ہیں اور ان میں بڑی بلاغت اور تاثیر ہوتی ہے میرے خیال میں تو موال زحل۔ عتابا اور محنتی (عربی دیہاتی گانے) میں وہ نئے نئے نفیس کلمات لطیف استعارے اور قابل تعریف تعبیرات موجود ہیں اگر ہم ان کا مقابلہ

ان معیاری قصائد سے کہیں جو فصیح زبانوں میں کہے جاتے ہیں اور جبراً انداز
 ماہناموں میں شائع ہوتے ہیں تو اس طرح خوبصورت معلوم ہوں جیسے سچان
 کا گلہ رستہ لکڑیوں کے ڈھیر کے ساتھ یا جیسے تلپنے گلے والی لڑکیوں کا غول
 جدید اطالوی زبان زمانہ وسطیٰ میں ایک عامی زبان تھی۔ اس زمانے کے خاص
 کا طبقہ: زبان کو "لہجہ" دکنواروں کی زبان کے نام سے پکارا کرتا تھا لیکن جب
 ڈیٹے - تبراک - کامونس اور فرانسیسی ورسینری نے اسی
 زبان میں اپنا بہترین اور غیر فانی کلام دُنیا کے سامنے پیش
 کیا تو یہی زبان اٹلی کی فصیح زبان سمجھی جانے لگی اور اس کے بعد
 لاطینی زبان لاش کی طرح صرف چند رجعت پسند جماعتوں
 کے کندھوں پر پڑی ہوئی ملک میں لشت لگاتی رہی۔ مقرر شام اور عراق
 کے عوام کی زبان اور رموی اور تہنی کی زبان میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کلاٹلی
 کے عوام اور وفیدی اور فرجیل کی زبان میں تھا۔ بالکل اسی طرح اگر مشرق
 میں بھی کوئی مافوق الفطرت ہستی پیدا ہوئی تو اس عامی زبان کا
 شمار فصیح و طبع زبانوں میں سے ہو گا۔ یہ الگ بات ہے کہ مجھے کوئی اُمید نہیں
 کہ مشرق میں ایسا کوئی انسان پیدا ہو گا جس کی وجہ سے کہ ہم مشرق کے

رہنے والے حال و استقبال کی نسبت اپنے ماضی کی حیا سب زیادہ نکل
رہتے ہیں اور جانے بوجھے یا بے سمجھی سے اپنے ماضی کی حفاظت ہی میں لگے
رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر ہم میں کوئی انسان پیدا بھی ہو تو وہ اپنی
فطری خوبیوں کو اسی قدیم طرز میں ظاہر کر لگیا۔ حالانکہ اسلام کا طریقہ فکر کی
پیدائش اور موت کے درمیان مختصر ترین راستہ کے سوا اور کچھ نہیں۔

(۷) عربی زبان کو زندہ کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہے؟

زبان کو زندہ کرنے کا بہترین ذریعہ نہیں بلکہ واحد ذریعہ شاعر کے
دل میں ہے اس کی زبان پر ہے اور اس کے ہاتھ میں ہے۔ قوتِ ایجاد
کی درمیانی کوئی شاعر ہی ہے۔ شاعر ہی وہ کڑی ہے جو دل میں پیدا
ہونے والے خیالات کو دنیا کی نظروں کے سامنے لاتا ہے اور ذہنی دنیا
کے مضبوط شدہ امور کو حفظ و تدبیر کی دنیا میں لا ڈالتا ہے۔

شاعری زبان کا باپ اور اس کی ماں ہے۔ جہاں شاعر جاتا ہے
وہیں زبان جاتی ہے۔ جہاں شاعر ٹھہرتا ہے اسی جگہ زبان بھی ٹھہرے
ڈال دیتی ہے اور جب وہ شاعر دنیا کو چھوڑ جاتا ہے تو زبان اس کی قبر پر
بیٹھ کر مدتی ہے اور اس وقت تک آہ دہکا کرتی رہتی ہے جب تک کہ کوئی

اور شاعر اگر اس کا ہاتھ تھام نہ لے۔
 جس طرح شاعر زبان کا ماں باپ ہے اسی طرح اندھی تقلید کرنے
 والا اُس کا کفن دوزخ اور گورکن ہے۔

شاعر سے میری مراد ہر وہ موجود ہے خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، اور وہ
 شخص ہے جو اسرار کو کھول کر بیان کرے وہ کمزور ہو یا طاقتور، ہر تہی بنیاد
 رکھنے والا ہے وہ باعزت ہو یا حقیر، خالص زندگی کا مردہ خبر خواہ جو قوم
 کا امام ہو یا بے بس فقیر، اور ہر وہ شخص ہے جو گردشِ لیل و نہار کے سامنے
 کمر بستہ کھڑا ہو چاہے وہ فلسفی ہو یا باغ کا مالی۔

مقلد سے میری مراد ہر وہ شخص ہے جو اپنی طبیعت سے کوئی چیز
 پیدا کرے جو اپنے آپ کسی بھید کے رمز کھیل نہ سکے بلکہ اُس کی
 نفسانی زندگی اپنے معصروں کی امداد پر موقوف ہو اور وہ اپنا معنوی لباس
 اُن لوگوں کے پھٹے پڑنے کپڑوں سے بنائے جو اس سے پہلے گزر چکے ہیں
 شاعر سے میری مراد وہ کسان ہے جو اپنی کھیتی میں ایسا بل چلاتا ہے
 جو اس کے باپ کے ہل سے مختلف ہو۔ خواہ وہ فرق کیسا ہی معمولی کیوں
 نہ ہو تاکہ بعد میں آنے والے لوگ اس نئے ہل کو کسی نئے نام سے پکار دیں۔

میری مراد وہ باغبان ہے جو زرد اور سرخ پھول کے درمیان ایک نئے رنگ کا پھول پیدا کرتا ہے اور بعد میں آنے والی نسل اس نئے پھول کو نئے نام سے پکارتے، میری مراد وہ جلاہ ہے جو اپنی کھادی پر ایسے ایسے نقش و نگار کا کپڑا تیار کرتا ہے جو اسی کے پڑوسی جلاہوں کے نقش و نگار سے مختلف ہو اور بعد میں آنے والے انسان اس کپڑے کو نئے نام سے پکارتے ہیں۔ شاعر سے میری مراد وہ ملاج ہے جو اپنی کشتی کے دو بادبانوں کے ساتھ ایک اور بادبان کی زیادتی کرتا ہے۔ اور وہ معماری ہے جو ایک دروازہ اور ایک کھڑکی رکھنے والے گھروں میں ایک ایسا مکان بناتا ہے جس کے کمرے ہیں دو دروازے اور دو کھڑیاں ہوں۔ شاعر سے میری مراد وہ رنگ ساز ہے جو ایسے رنگوں کو آپس میں ملاتا ہے جو اس سے پہلے کسی نے نہیں ملائے اور اس طرح ایک نیا رنگ دُنیل کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ایسے ملاحوں، معارِ دلوں اور رنگ سازوں کے بعد آنے والی قوم ان کی کارگیری کو ایک نئے نام سے پکارتیگی۔ اور اس طرح لغت کی کشتی میں ایک بادبان، لغت کے کمرے میں ایک کھڑکی اور لغت کے لباس میں ایک رنگ کا اضافہ ہوگا۔

معتقد وہ انسان ہے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ کو اسی راستے سے

جانتا ہے جس پر ہزاروں قافلے اس سے پہلے گزرے ہوئے گئے صرف اس خوف سے کہ کہیں وہ راستہ مجھ بول کر گم نہ ہو جائے۔ — وہی انسان جو اپنی معیشت، اپنی کمائی اور اپنے لباس میں وہی ماہیں اختیار کرتا ہے جن پر اس سے پہلے ہزاروں قویں گزری ہیں۔ اس طرح تو اس کی زندگی صرف ایک صدائے بازگشت ہے اور اس کا وجود ایک دور کی حقیقت کا گم نام سایہ ہے جس سے نہ وہ کچھ پہچان سکتا ہے اور نہ ہی وہ پہچاننے کا ارادہ رکھتا ہے۔

شاعر سے میری مراد وہ عبادت گزار ہے کہ جب وہ اپنے نفس کے مندر میں داخل ہوتا ہے تو بیک وقت روتا اور خوش بھی ہوتا ہے۔ سوگ کرنا اور خوشی کے گن بھی گاتا ہے۔ سنتا اور سناتا ہے پھر جب وہ باہر نکلتا ہے تو اس کے ہونٹوں اور اس کی زبان پر ان آیام کی عبادت کی مختلف اشکال اور راتوں کے مراقبوں کے مختلف اقسام کے لئے مختلف اسماء افعال اور حروف ہوتے ہیں اور اس طرح اس کے اس عمل سے لغت کی سادگی میں چاندی کے ایک تار اور لغت کی آگ میں جلنے کیلئے ایک اچھی دھوئی کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

اور مقلد وہ عبادت گزار ہے جو نمازیوں کی نمازاں اور کلمہ خاندن کے کلمات کو بلا ارادہ اور بے سوچے سمجھے دہراتا ہے اور اس طرح لغت کو اُسی مقام پر چھوڑ دیتا ہے جیسے اسے ملا تھا۔

شاعر سے میری مراد وہ عاشق ہے کہ اگر اسے کسی عورت سے عشق ہو جائے تو اس کی رُوح انسانوں کی راہ چھوڑ کر نہمانی اختیار کر لیتی ہے تاکہ وہ محبت کے شیریں خوابوں، آگ کے شعلوں، رات کی ہولناکیوں، آندھیوں کی دہشت اور روادیلوں کے سکون کا لباس پہن لے۔ پھر وہ اپنے انسانوں کی طرف اس لئے لوٹتا ہے کہ اپنے تجربات کا تاج لغت کے سر پر رکھے اور اپنے صبر و سکون کا ہار ادب کے گلے میں پہنا دے۔

لیکن مقلد اپنی محبت میں بھی مقلد ہی رہتا ہے وہ غزل و تشبیہ میں بھی دوسروں کی پیروی کیا کرتا ہے۔ اور اسی وجہ سے اگر وہ اپنی مجبرہ کے حسین چہرے اور اُونچی گردن کا ذکر کرتا ہے تو اسے چودھویں کا چاند اور ہرنی سے تشبیہ دیتا ہے اگر اسے اپنی مجبرہ کی سیاہ زلفوں، سیدھے قد اور سر مگیں آنکھوں کی یاد آتی ہے تو وہ انہیں رات، نرم دناڑک، شاخ اور تیر سے تشبیہ دیتا ہے۔ اگر کبھی وہ شکوے شکایت پر اُتر آتا ہے۔ تو

”بیدار بلکپوں“ اور ”جائی کے قُرب“ ہی کا نام لیتا ہے۔ اگر دُہ اپنے بیان کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر سنش کرنا چاہے تو کہتا ہے۔ ”میری محبوبہ کے رُخسار گلاب کے پھل کو سیراب کرنے کے لئے زکسی آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی بہاتے ہیں اور دُہ اپنی عناب جیسی انگلیوں کو برف جیسے دانتوں سے کاٹتی ہے۔“ غرض کہ ہمارا اندھا مغلّہ اسی طرح کی باتیں کرتا رہتا ہے اور اسے کچھ تپہ نہیں ہوتا کہ دُہ اپنی کُنڈ نہنی کی وجہ سے ادب کو زہرِ اوردگر رہا ہے اور اپنے شوقیانہ انداز سے ادب کی شرافت کو ختم کرنے کے دپلے ہے۔

میں جدت پسند طبائع کے فائدوں اور جامد طبیعتوں اور اُن کے نقصانات کا تذکرہ کر چکا۔ لیکن اُن لوگوں کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا ساری زندگی ڈکشنریاں بنانے، انسائیکلو پیڈیا مرتب کرنے اور ادبی ادارے قائم کرنے میں گزارتے ہیں۔ میں نے ان کے متعلق اس لئے کچھ نہیں کہا کہ میرا خیال ہے یہ لوگ زبان کے مدوجز میں کنارے کی مثال رکھتے ہیں۔ ان کا کام پھلنی سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ یہ کام کچھ بُرا نہیں لیکن جب قوم کی قوتِ تخلیق کا ریزہ کاشت کر لے۔ سو کھٹے تنکوں کی فصل

کھانٹنے اور اپنے کھیلانوں میں کانٹے جمع کرنے کے سوا اور کسی قابل نہ رہی ہو
تو چھاننے والا کیا پھلنے گا۔ خاک چھانٹے گا !

میں پھر کہتا ہوں کہ زبان کی اجسام اس کی وحدت اس کی
عمومیّت اور اس کے تمام متعلقات شاعر ہی کے خیالات کے مرہون منت
تھے ہیں اور رہیں گے۔ لیکن کیا ہم میں شاعروں کی جماعت موجود ہے ؟
ہاں ! ہم میں شاعر موجود ہیں۔ بلکہ مشرق کا ہر باشندہ شاعر بن سکتا
ہے۔ چاہے وہ کھیت میں کام کر رہا ہو یا باغ میں مصروف ہو۔ چاہے
وہ کھادی پر بیٹھا ہو یا عبادت خانے میں ہو۔ چاہے وہ منبر پر کھڑا خطبہ
دینے میں مشغول ہو یا اپنی لائبریری میں مطالعہ کر رہا ہو۔ اسی طرح مشرق
کا ہر باشندہ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ وہ تعلید کے قید خانہ سے باہر
نکل کر سورج کی روشنی میں آئے اور زندگی کے قافلے کے ساتھ گامزن ہو
مشرق کا رہنے والا یہ طاقت رکھتا ہے کہ وہ اپنی رُوح میں چھپی ہوئی
قوت کو بیدار کر دے۔ وہی قوت جو ہمیشہ ہمیشہ سے موجود ہے تا ابد
باقی رہیگی وہی قوت جو پتھروں سے خدا کے بیٹے بنانے کی طاقت رکھتی ہے
لیکن وہ لوگ جو اپنے فطری جذبات کو نظم و نثر کا رنگ دے کر پیش

کیا کرتے ہیں ان سے میں مستعدی ہوں کہ تمہارے خصوصی مقاصد میں سے
 ایک مقصد یہ بھی ہونا چاہئے کہ تم متقدمین کی تقلید نہیں کرو گے۔ اس میں
 تمہاری بھی بھلائی ہے اور عربی زبان کی بھی۔ تمہاری وہ چھوٹی سی جھونپڑی
 جو تم اپنی طرف سے تیار کر لو اس عالیشان محل سے زیادہ بہتر ہے جو دوسروں
 کے رحم و کرم پر ہو۔ تمہارے نفوس میں البیاض جذبہ ہونا چاہئے جو تمہیں مدحیہ
 قصائد، مراثی اور تعینت ناموں کے لکھنے سے روکے۔ تمہارے لئے اور
 عربی زبان کیلئے یہ زیادہ بہتر ہے کہ تم حقیر اور بیکار موت مرو بجاتے اس کے
 کہ تم اپنے دل کا خون انسانی نبضوں کے سامنے بہاؤ۔ تم میں ایسی قومی غیرت
 ہونی چاہئے جو تمہیں اپنے مشرقی تمدن اور اس کے مسرت دالم کی طرف
 دھکیلے یہی تمہارے لئے اور عربی زبان کیلئے بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ تم
 اپنے ماحول کے حوادث سے متاثر ہو کر اپنے خیالات کو مغربی شاعروں کے
 رنگ میں رنگ دو۔

اے زمین!

زمین! تو کتنی حسین اور کتنی خوبصورت ہے!
تو روشنی کا حکم ملنے کیلئے کتنی تیار رہتی ہے اور سورج کے سامنے سر
جھکانے کو فخر سمجھتی ہے۔

سائے کا لباس پہن کر تو کتنی عجیب نظر آتی ہے اور رات کی تاریکی
کی چادر اڑھ کر تو کتنی پیاری لگتی ہے۔
تیرے صبح کے گیت کتنے میٹھے ہیں اور تیری شام کی صدائیں کتنی
بہر لگ ہیں۔

زمین! تو کتنی مکمل اور کتنی روشن ہے۔

میں تیرے میدانوں میں پھلا، تیرے پہاڑوں پر چڑھا، تیری وادیوں
میں اُترا، تیری چٹانوں پر سے کودا، تیری غاروں میں گھسنا، میدانوں
میں تیرے تحمل کو پہچانا، پہاڑوں پر تیری عنبریت کا اندازہ لگایا، وادیوں
میں تیرے سکون کا نظارہ دیکھا، چٹانوں پر تیرے عزم کا نشانہ دیکھا اور غاروں
میں تیری رازداری کا تپہ لگایا۔ تو ہی ہے جو اپنی قوت کے باوجود بھیلی ہوئی
ہے، اپنی تواضع کے باوجود سر بلند اور بلندی کے باوجود پست ہے، اپنی سختی
کے باوجود نرم ہے اور اپنے بے شمار مجیدوں کے باوجود ہر ایک کے سامنے
کھلی ہوئی ہے۔

میں نے تیرے سمندروں میں سفر کئے، تیرے دریاؤں میں اُترا اور
تیری ندیوں کے کنارے کنارے چلا، ہر جگہ میں نے تیرے مد و جزر میں
بقا کی آواز سنی، زمانہ کہ تیرے ٹیلوں اور صحراؤں میں گنگناتے ہوئے پایا۔
گھائیوں میں اور راستوں کے موڑ پر زندگی کو زندگی سے سرگوشی کہتے ہوئے
دیکھا، تو ہی بقا کی زبان اور اس کے ہونٹ ہے تو ہی زمانہ کے تار اور اس
کی انگلیاں ہے اور تو ہی زندگی کا فکر اور اس کا بیان۔

تیری باد بہاری نے مجھے جگایا اور تیرے جنگلوں کی جانب لے گئی
 جہاں تیری آہیں دھواں بن کر اڑتی ہیں۔ تیری گرمی مجھے تیرے ہی
 باغوں میں لے گئی۔ جہاں تیری کوششیں پھلوں کی صورت میں ظاہر
 ہوتی ہیں تیری خزاں مجھے تیری ہی انگور کی بیوں کے پاس لے جا کر کھڑا کر
 گئی جہاں تیرا خون شراب کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور تیری سردی مجھے
 تیری ہی آرا نگاہ کی طرف لے گئی۔ جہاں تیرا شفا پانی بہت بکھیرتا ہے
 غرض تو ہی موسم بہار میں نمکتی ہے۔ گرمی میں بارانِ کرم برساتی ہے۔ خزاں
 میں فیاضی کرتی اور سردی میں صاف ہو کر سامنے آتی ہے۔

ایک خوشگوار رات کو میں اپنے نفیس کے دروازے اور کھڑکیاں کھول
 کر تیری جانب نکلا۔ میری طبیعت حرصِ طبع کی وجہ سے بوجھل تھی اور میں
 غور و فکر سے بھاری زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ میں تیرے ستاروں کی طرف
 ٹٹکی باندھے دیکھتا رہا اور وہ تیری جانب دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ میں نے
 اپنی بڑیاں اور بوجھل زنجیریں دور پھینک دیں اور میں اچھی طرح جان گیا
 کہ نفس کا حقیقی مقام تیری فصلا ہے۔ اس کی اصلی خواہشات تیری خواہشات
 سے وابستہ ہیں۔ اس کی سلامتی تیری سلامتی ہے اور اس کی سعادت سہرے

خبر میں ہے جو ستاروں کی جانب سے تجھ پر بھیج دیا جاتا ہے۔

میں بادلوں میں گھری ہوئی رات میں نیمری طرف نکلا۔ میں اپنی غفلت و جمود سے اکتا گیا تھا۔ میں نے تجھے ڈراؤنا اور آندھبوں سے مسلح پایا۔ تو اپنے حال کے ذریعے اپنے ماضی سے لڑ رہی تھی، اپنی جدت کی طاقت سے اپنی قدامت کو کچھاڑ رہی تھی اور کمزور کو قوی کا سہارا دے کر اٹھا رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ انسان کا نظام تیرا ہی نظام ہے۔ اُس کا قانون تیرا ہی قانون ہے۔ اور ان کا راستہ تیرا ہی راستہ ہے اور میں نے معلوم کر لیا کہ جو کوئی اپنی خشک شاخوں کو اپنی ہی ہواؤں سے نہیں جھاڑ دے گا وہ مایوسی و نامرادی کی موت مر جائیگا۔ اور جو کوئی اپنے ہی حملوں سے اپنے بوسیدہ درقوں کو مکڑے کے ٹکڑے کر کے نہیں پھینکے گا وہ نامراد ہو کر فنا ہو جائیگا اور کوئی اپنے ماضی کے مردہ واقعات کو نسیان کے کفن میں دفنایگا نہیں، تو وہ اپنے استقبال کے لئے کلن بن کر رہیگا۔

زمین! تو کتنی معصوم ہے اور تیرا علم کتنا زیادہ ہے؟
 اے تو اپنے اُن فرزندوں کے لئے کتنی شفیق ہے جو حقیقت کو چھوڑ کر

ادبام میں بھیسے ہوئے ہیں اور جو حاصل کردہ اور ناما حاصل شدہ مقاصد کے درمیان راہ گم کئے ہوئے ہیں۔

ہم روتے چختے ہیں اور نُو سنستی ہے۔

ہم گناہ کرتے ہیں اور نُو اس کا کفارہ دیتی ہے۔

ہم تجھے روندتے ہیں اور نُو ہمارے پاؤں میں کچی جاتی ہے۔

ہم ناپاک ہوتے ہیں اور نُو ہمیں پاک کیا کرتی ہے۔

ہم سوتے ہیں اور خواب دیکھنے سے محروم ہیں اور نُو ہمیشہ بیدار ہو کر بھی

خواب کی دنیا کی سیر کرتی ہے۔

ہم تیرے سینے میں تلواروں اور نیزوں سے زخم لگاتے ہیں اور نُو

زیتون اور ملبسم سے ہمارے زخموں کو مندیل کرتی ہے۔

ہم تیرے وسیع میدانوں میں ہڈیاں اور کھوٹیاں کاشت کرتے ہیں۔

ہم مُردار لاشیں نیزے سپرد کرتے ہیں اور نُو ہمارے خوشوں کو دانوں

اور انگوروں کی سیلوں کو خوشوں سے پر کرتی ہے۔

ہم تیری سطح کو خون سے داغدار کرتے ہیں اور نُو ہمارے چہروں کو کوثر کے

پانی سے دھوئی ہے۔

ہم تیرے چاروں عناصر حاصل کر کے ان سے توپ اور بندوق تیار کرتے ہیں لیکن تو ہمارے عناصر کو یکجا کر کے ان سے گلاب اور حنبل کے پھول اگاتی ہے۔

زمین! تیرا صبر کتنا بڑا اور تیری رحمدلی کتنی زیادہ ہے۔

زمین! تو کیا ہے اور کون ہے؟

کیا تو گرد و غبار کا ایک ذرہ ہے جو اللہ کے قدموں میں اس وقت اٹھا جبکہ وہ کائنات اس سے سو اس سے سو کی طرف چلا۔ یا تو لا انتہا کی ایک چکاری ہے جو دنیا میں بھینکی گئی ہے۔

کیا تو کھجور کی وہ گٹھلی ہے جو اس لئے پھینکی گئی کہ اپنے جوشِ نمر سے چھلکے کو بچاؤ دے اور خدائی طاقت کے اتھیرے بھی بلند ہو۔

کیا تو سب سے بڑے جبار کی رگوں میں خون کا ایک قطرہ ہے یا اس کی پیشانی پر بہنے والے پسینہ کی ایک بوند؟

کیا تو وہ پھل ہے جسے سورج کافی دیر کے بعد ظاہر کرتا ہے؟ کیا تو

اس ابدی درخت کا پھل ہے جس کی جڑیں ازل کی گہرائی تک پھلتی اور جس کی شاخیں ابد کی بلندی تک پڑھتی ہیں؟ کیا تو کوئی ایسا جو ہرے جسے نماز

کے معبود نے مسافت کے معبود کی تھیلی پر رکھ دیا ہے۔

کیا تُو فضا کی گود میں کھیلتا ہوا کمن بچہ ہے؟ یا وہ بوڑھا ہے جو
زمانہ کے لیل و نہار کے تجربات سے نفع اندوز ہو کر ان کی نگرانی کرنا رہتا ہے؟
زمین! تُو کیا ہے اور تُو کون ہے؟

زمین! سچ تیہ ہے کہ تُو میری ذات ہے تُو ہی آنکھیں اور آنکھوں کی
بصیرت ہے۔ تُو ہی میری عقل، میری عجب اور میری نیند ہے۔ تُو ہی میری
بھوک اور پیاس ہے۔ تُو ہی میری مسرت اور میرا غم ہے۔ تُو ہی میری غفلت
اور بیداری ہے۔

تُو ہی میری آنکھوں کا نور، میرے دل کا شوق اور میری روح کا
دوام ہے۔

زمین! تُو میری ذات ہے اگر میں نہ ہوتا تو تیرا وجود بھی نہ ہوتا۔

میں

وہ اپنے انتہا پسنداء خیالات میں جنون کی حد تک پہنچ چکا ہے۔
میرا خیال ہے وہ اس لئے لکھتا رہتا ہے کہ لوگوں کے اخلاق خراب
ہوں۔“

اگر شادی شدہ اور غیر شادی شدہ مرد اور عورتیں شادی کے معاملے
میں جبراً ان کے انکار کی پیروی کرنے لگیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خانہ داری کے
ستون گر جائیں گے۔ انسانی جماعت کی بنیادیں ہل جائیں گی اور یہ دنیا ایسے
جہنم کی شکل اختیار کرے گی جس میں شیطان بستے ہوں۔

اُس کے سلوب صحافت کی آرائش و زینت خاک میں مل جائے دُہ تو انسانیت کا دشمن ہے۔“

”وہ اشتراکی ملحد اور کافر ہے۔ ہم اس پاک سرزمین کے باشندوں کو نصیحت کے طور پر کہتے ہیں کہ اس کی تعلیمات سے دُور رہیں اور اس کی کتابوں کو جلا ڈالیں تاکہ ان کا کوئی اثر اُن کے نفوس پر باقی نہ رہے۔“

”ہم نے اس کی کتابیں پڑھ ڈالیں اور دیکھا کہ وہ میٹھے زہر کی مثال رکھتا ہے۔“

یہ میرے متعلق بعض لوگوں کی رائے ہے اور ٹھیک ہے اس لئے کہ میری انتہا پسندی جنون کی حد تک پہنچ چکی ہے میں تعبیر کی نسبت تحریب کے ببادہ درپے ہوں۔ میرا دل ان چیزوں سے متنفر ہے جن کی لوگ تعظیم کرتے ہیں اور میرے دل میں اُن چیزوں کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے جن سے تمام لوگ متنفر ہیں۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں انسانی جماعت کے خیالات، معتقدات اور تعلیدی ارادوں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ رکھتا۔

بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ میری کتابیں میٹھے زہر کی مانند ہیں۔ ایک حقیقت جو مضبوط پردے کی آڑ سے ان کو نظر آتی ہے۔ صاف حقیقت تو یہ ہے کہ میں زہر کو کسی اور چیز میں ملا کر نہیں دیتا۔ بلکہ خالص زہر ملا تا ہوں۔ — فرق اتنا ہے کہ زہر کے پیالے صاف و شفاف ہوا کرتے ہیں۔

وہ لوگ جو اپنے دلوں کو میری طرف سے یہ عذر پیش کر کے اطمینان دلاتے ہیں کہ ”وہ ایک خیالی آدمی ہے جو با دلوں کی دنیا میں اڑنا چاہتا ہے۔“ وہ وہی لوگ ہیں جن کی نظر صرف اُن شفاف پیالوں پر پڑتی ہے اور ان کے اندر بھری ہوئی شراب یا دھڑنگ ان کی نگاہ رسائی نہیں کرتی۔ اس لئے کہ ان کے کمزور معدے اس کو ہضم کرنے کے قابل نہیں۔ یہ تمہید ایک کوخت بے حیائی ظاہر تو کرتی ہے لیکن کیا یہ واقعہ نہیں کہ دل کو چھیدنے والی بے حیائی شیریں الفاظ سے ادا ہونے والی جفاقت سے بہتر ہے۔ بے حیائی اپنے اصلی رنگ میں اپنے آپ کو پیش کرتی ہے لیکن جفاقت اور بے ایمانی ایسے لباس میں ظاہر ہونے کی کوشش کرتی ہیں جو اس کے لئے سلایا نہیں گیا۔

مشرق کے باشندے ہر مضمون ایسا چاہتے ہیں کہ وہ تشبیہ کی مکتی

کی طرح با فاقہ میں پھر پھر کہ کلیوں کا رس چڑھے، اسے جمع کرے اور اسے شہد کے چھتے تیار کرے۔

مشرق کے باشندے شہد ہی کو پسند کرنے میں اور اس کے علاوہ کوئی طعام ان کو اچھا نہیں لگتا۔ وہ شہد کھانے میں اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ ان کے نفوس سراسر لیا شہدین گئے ہیں جو آگ کی گرمی سے بہ جاتا ہے اور برف کے تودوں پر رکھتے بغیر مسموم نہیں ہو سکتا۔

مشرق کے باشندے ہر شاعر سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو ان کے بادشاہوں، افسروں اور پادریوں کے سامنے دھونی کی طرح جلائے مشرق کی فضا اس دھوئیں سے جو شاہی محلوں، قربانگاہوں اور مقبروں سے اُٹھتا ہے مکدر ہو چکی ہے۔ لیکن ابھی وہ اس کو اور مکدر کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے ہی زمانے میں ایسے مدح گو شاعر موجود ہیں جو تبتی سے کم نہیں ایسے مرثیہ خوان پائے جاتے ہیں جو غنساء سے بڑھے ہوئے ہیں اور ایسے تہنیت خواں بھی کم نہیں جو صفی الدین حلی کو مات کرتے ہوں۔

مشرق کے باشندے ہر مفکر سے یہ اُمید رکھتے کہ وہ ان کے آباد اجلا

کی تاریخ کی چھان بین کرے۔ وہ انہیں کے آثار و معتقدات کی تعلیم دیتا ہے
وہ اپنے قیمتی اوقات کی ہر گھڑی ضرا نہیں کی طول طویل لغات، الفاظ
کے ہیر پھیر اور اس کے معانی و بیان میں صرف کر دے۔

مشرق کے رہنے والے ہر مفکر سے یہی سننے کے خواہشمند ہیں کہ
بیدما، ابن رشد، افرام سمرانی اور یہ خدا و مشقی نے کیا کہا تھا۔ وہ چاہتے
ہیں کہ وہ اپنے مضامین میں بے کار نصیحتوں اور ارشادات اور ان میں شہال
مہونے والے ان مواعظ و نصائح کے سوا اور کچھ نہ لکھے جن پر عمل پیرا ہونے
والے انسان کی زندگی گھاس کے اس کمزور تنکے کی طرح ہو جاتی ہے جو
سائے میں اُگا ہوا ہو اور اس کا نفس اس پانی کی طرح ہو جاتا ہے جس
میں حقوڑی سی افیون گھول دی گئی ہو۔

مختصر یہ کہ مشرق کے باشندے گذرے ہوئے زمانہ کے خیالات
میں زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ دل کو بھانے والی اور ہر قسم کے نگرہ
غم سے آزاد کر دینے والی لالچنی باتوں کو پسند کرتے ہیں۔ اگر ان کو پسند نہیں
آئے تو وہ افکار پسند نہیں آتے جو تعمیری ہوں جہان کو بھنبھوڑ کر اس
گہری نیند کے خمار سے بیدار کر دیں جن میں غافل پڑے ہوئے بیٹھے اور

پرسکون خواب دیکھنے میں دُست ہیں۔

مشرق دُہ مرد بیمار ہے جس پر باری باری ہر مرض حملہ آور ہوا اور
دبائی امراض اس سے چمپے رہے۔ یہاں تک کہ وہ اس بیماری کا عادی
بن گیا مصیبتوں سے محبت ہو گئی۔ وہ اپنے مصائب و تکالیف کو نہ صرف
یہ کہ اپنی طبعی کیفیات سمجھنے لگا بلکہ ان کو ایسے اچھے اخلاق کا رتبہ دیدیا جو
اچھی رُحوں اور صحیح جہوں میں پائے جاتے ہیں اور اسی لئے جب وہ
دیکھتا کہ کوئی فرد ان امراض کا مریض نہیں تو اسے خدا کے عطا کردہ
کمالات و احسانات سے محروم سمجھنے لگتا۔

مشرق کے بے شمار ڈاکٹر اس مریض نے بستر کے گرد بھرتے ہیں
اس کے علاج کے لئے آپس میں مشیرے کرتے ہیں لیکن انوس ان میں
سے کوئی بھی اس کا صحیح علاج نہیں کرتا۔ بغیر اس کے کو وقتی طور پر سکون
پیدا کرنے والی دوائیں پلا کر مرض کو دُور کرنے کی بجائے اسے طول دینے
کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ مدہوش کرنے والی دوا میں مختلف طرح کی مختلف شکل کی اد

مختلف رنگ کی ہیں۔ یہ ایک دوسری کی ملاوٹ ہی سے بنتی ہیں۔ جس طرح کہ ایک مرض سے دوسرا مرض پیدا ہوتا ہے جب بھی مشرق میں کوئی جدید مرض نمودار ہوتا ہے مشرق کا طبیب اس کے لئے بہوشی کی ایک نئی دوا تجویز کر دیتا ہے۔

اسی طرح وہ اسباب بھی پیشا ہیں جن کی وجہ سے مرض اس قسم کی دواؤں کی آڑ لیتا ہے۔ ان میں سب سے اہم دو سبب ہیں ایک تو یہ کہ مریض اپنے آپ کو قصداً قدر کے مشہور نظریے کے حوالے کر دیتا ہے اور دوسرا یہ کہ طبیب بزدل ہیں وہ ڈرتے ہیں کہ تکلیف دہ دوا دینے سے مریض کا مرض بھڑک نہ اٹھے۔

مشرق کے یروہانی طبیب ہمارے اس مرد بیمار کی خانگی، وطنی اور مذہبی بیماریوں کے لئے جس قسم کی مدہوش کن دوائیں پلاتے ہیں ان کی چند مثالیں سن لیجئے:-

شہر اپنی بیوی سے اور بیوی اپنے شوہر سے بعض فطری اس کی بنا پر تنگ اگر ایک دوسرے سے رٹتے ہیں۔ مار پیٹتی ہوتی ہے ایک دوسرے کو چھوڑ جاتے ہیں لیکن ابھی پورا ایک دن گزرنے نہ۔

پاتا کہ شوہر کے خاندان والے بیوی کے خاندان کے افراد سے ملتے ہیں
 ملمع سازی سے چمکتے ہوئے خیالات ایک دوسرے کے سامنے رکھتے ہیں
 اور وہ متفق ہو جاتے ہیں کہ میاں بیوی میں صلح کرائی جائے عورت کو بلایا
 جاتا ہے اُسے چٹھی مٹھی باتوں اور دل کو نرم کرنے والے نصائح سے رام
 کیا جاتا ہے اور اس طرح وہ مطمئن نہ ہونے کے باوجود شرم کے مارے
 تسلیم خم کر دیتی ہے۔ پھر شوہر کو بلایا جاتا ہے اور اس کے دماغ کو زنگار
 امثال و اقوال کے ذریعے ماذن کر دیا جاتا ہے جن کی وجہ سے اس کے
 خیالات نرم تو ہو جاتے ہیں لیکن بدستے نہیں۔ اور یوں دینی طور پر پھر
 دونوں کے درمیان صلح ہو جاتی ہے۔ ان کی رُو میں ایک دوسرے سے
 متنفر ہونے کے باوجود ایک ہی گھر میں ایک ہی چھت کے نیچے اپنے ارادے
 کے بالکل خلاف زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ جب خوشی و آوارہ
 کی پلائی ہوئی نشہ آور دوا کی مدد پرستی اور اس کا اثر زائل ہوتا ہے —
 جو ضرور ہی زائل ہوتا ہے — اُس وقت مرد و بیوی عورت سے نفرت
 کا اظہار کرنے لگ جاتا ہے اور اسی طرح بیوی اپنی نابالغی کو بے نقاب
 کرنے لگ جاتی ہے لیکن وہی لوگ جنہوں نے پہلے ان دونوں کو بے ہوشی

کی بنید مسلایا تھا وہ پھر ان کو سہیوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی طرح جنہوں نے پہلے اس شراب کے پیالے کا ایک گھونٹ پیا تھا وہ اب اس کا نشہ اُتارنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔

قوم کسی ظالم حکومت یا فرسودہ نظام کے خلاف بغاوت کرتی ہے
بیدار ہونے اور آزادی حاصل کرنے کے بلند ارادے لے کر اصلاحی انجمن
کی بنیاد ڈال دیتی ہے، پوری شجاعت اور بہادری سے تقریریں ہوتیں اور
اعلامات شائع ہوتے ہیں۔ اخبارات و رسائل جاری ہوتے ہیں اور ملک
کے گوشے گوشے میں دفن بھیجے جاتے ہیں لیکن مہینہ دو مہینے گزرنے نہیں پاتے
کہ قوم سُنتی ہے کہ جمعیت کا صدر یا نگران گرفتار کر لیا جاتا ہے یا اسے حکومت کی
طرف سے وظیفہ ملنا شروع ہوتا ہے اور اس کے بعد اصلاحی انجمن کا نام
سُننے میں نہیں آتا۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اس کے ارکان اپنی عادت کے مطابق
نیشلی دداپی کر سکون و اطمینان کی حالت میں بے ہوش ہو جاتے ہیں۔

ایسے ہی ایک جماعت اُٹھتی ہے وہ اپنے مذہبی پیشوا کے خلاف
علمِ بغاوت بلند کرتی ہے۔ اس کی ذات پر تنقید کرتی ہے۔ اس کے اعمال
کا جائزہ لیتی ہے۔ اس کی کارروائیوں کو بُری نگاہ سے دیکھتی ہے۔ پھر اس

کو ڈراتی ہے کہ وہ ایسے مذہب کو اختیار کر لینگے جو اس کے ادہام و خرافات کے بالکل خلاف اور عقل کے موافق ہے لیکن بہت تھوڑے دنوں کے بعد ہم سُنتے ہیں کہ اس ملک کے خیر خواہوں نے کوشش کر کے قوم اور اس کے پیشوا کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کو ختم کر دیا ہے اور جادو اثر نشیلی باتوں کے اثر سے اسی پیشوا کا زائل شدہ وقار از سر نو قوم کے دلوں میں پیدا کر دیا اور قوم پھر اسی پیشوا کی اندھی تقلید کرنے لگی۔

کمزور و بے بس انسان کسی ظالم و جابر کے ظلم کی شکایت کرنے لگتا ہے تو اس کا پڑوسی اسے کہتا ہے کہ خاموش رہو۔ اس لئے کہ جو آنکھ تیر کا مقابلہ کرنے پر آتی ہے وہ بھوڑ دی جاتی ہے۔

دیہاتی انسان گیشہ نشین زاهدوں کے اخلاق و تقدیٰ کی رشک کی نگاہوں سے دیکھتا ہے تو اس کا ساتھی اسے مخاطب کر کے کہتا ہے کہ زبان سے کوئی لفظ نہ نکالنا۔ کتاب میں آیا ہے کہ ان کی باتیں تو سن لیا کرو لیکن ان کے اعمال سے دور دور رہو۔

ایک شاگرد بصروں اور کوفیوں کے نحوی مناظروں کو بے کار سمجھ کر اس میں دقت ضائع کرنے سے پہلو بچا کر نکل جانا چاہتا ہے تو اس کا استاد اسے

ڈانٹ کر کہتا ہے کہ تیری طرح کاہل اور سست لوگ غدر گناہ بدتر از گناہ قسم کے بہانے تراش لیا کرتے ہیں۔

جب کوئی لڑکی بوڑھی عورتوں کی پُرانی عادات کی تقلید نہیں کرتی تو بعض کی ماں اسے کہتی ہے کہ تو مجھ سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ تجھے لازم ہے کہ اسی راہ پر چلو جس پر میں چلتی ہوں۔

نوجوان اُمّہ کہ مذہب میں انسان کی طرف سے بڑھائی باتوں کی تحقیق کرنا چاہتا ہے تو زائد خشک اسے یہ کہہ کر چپ کرانا ہے کہ جو شخص سرِ مذہبی حکم کو ایمان و یقین کی آنکھ سے نہیں دیکھے گا اسے اس دنیا میں دھند اور غبار کے سوا کچھ نظر نہیں آئیگا۔

اسی طرح زمانے کے دن رات گزرتے ہیں اور مشرق کا باشندہ اپنے نرم سبزِ رغبت میں ڈپا کر وٹیں بدلتا رہتا ہے۔ جب اسے مچھر کاٹتے ہیں تو تھوڑی دیر کے لئے آسمانیں کھول تو دیتا ہے لیکن پھر وہی غفلت اس پر طاری ہو جاتی ہے اور انہیں نشہ آور دواؤں کے اثر سے جواس کے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہیں اسی طرح مست پڑا رہتا ہے۔ جب کبھی کوئی انسان اُٹھتا ہے ران سونے والوں کو بکارتا ہے۔ ان کے گھر میں عبادت گاہوں اور

دفتروں کو اپنی چیخ و پکار سے بھر دیتا ہے تو وہ دائمی خمار سے بند رہنے والی پلکوں کو کھول کر 'جانتیاں لے لے کر کتے ہیں'۔ یہ کیسا انسان ہے جو نہ خود ستوتا ہے نہ اوروں کو سونے دیتا ہے "اتنا کہہ کر وہ پھر اپنی آنکھیں بند کر کے اپنی روح سے کہتے ہیں "یہ انسان کا فرہے"۔ بلکہ ہے۔ یہ نوجوانوں کے اخلاق خراب کرنے کے درپے ہے، یہ قوم کی بنیادوں کو گرا دینا اور انسانیت کو زہریلے تیروں سے پھلنی کرنا چاہتا ہے۔"

میں نے کئی بار اپنے نفس سے پوچھا کہ کیا وہ ان سرکش جاگنے والوں میں سے تو نہیں جو سکون بخش اور نشہ آور دواؤں کے پینے پر رضامند نہیں لیکن نفس مجھے ہمیشہ گول مول جواب دیتا۔ مگر جب میں نے دیکھا کہ لوگ میرا نام لے لے کر مجھے کوستے ہیں اور میری تعلیمات کو سن سن کر وہ کراہتے ہیں۔ اُس وقت مجھے اپنی بیداری کا یقین آ گیا اور میں جان گیا کہ میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اپنے آپ کو شیریں اور لذیذ خوابوں میں سکون پزیر خیالات کے سپرد کر دیں بلکہ میں ان تنہائی پسند انسانوں کا ایک جزو ہوں۔ جن کو زندگی تنگ اور پرچارہ ادویں میں گھسیٹے لئے جاتی ہے۔ ایسی ادویں

جو جھپٹنے والے بھڑیلوں اور مٹی بولی بولنے والی ملبلوں سے معمور ہو۔
 اگر یہ بیداری کوئی فضیلت ہوتی تو میری نگہ لی مجھے اس سے یقیناً
 روکتی لیکن یہ کوئی فضیلت ہے ہی نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جو
 نہنائی پسند افراد پر ان کی غفلت میں ظاہر ہوتی ہے اور ان کے آگے آگے
 چلتی ہے۔ وہ لوگ اپنے ارادے کے خلاف اس کے پیچھے چلتے ہیں۔ اس
 کی پوشیدہ کشش سے وہ کچھ چلے جاتے ہیں اور اس کے ہیتناک معانی کی
 طرف بھٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

میرا تو یہ خیال ہے کہ شخصی حقائق کے اظہار میں ایک قسم کی ریا ہے
 جسے مشرق کے باشندوں کی زبان میں تہذیب کہا جاتا ہے۔

کل مفکر اور ادیب میرے ان گذشتہ خیالات کو پڑھ کر غصے سے
 کہیں گے۔ یہ حد سے تجاوز کر چکا ہے۔ یہ زندگی کے تاریک پہلو ہی کو دیکھتا
 ہے اور اسی وجہ سے اسے تاریکی کے سوا کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔ یہ تو
 اس سے پہلے بھی بہت مرتبہ ہمارے درمیان کھڑا ہو کر پکارا تھا کہ ہمارے ہمارے
 حالت پر رونا اور افسوس کرنا رہا ہے۔

ان منظرین سے میں کتا ہوں میں مشرق کا نہج اس لئے کرتا ہوں کہ
مردہ لاش کے سامنے ناچنا جنون ہے۔

میں اہل مشرق پر اس لئے روتا ہوں کہ امراض کی وجہ سے ہنسنا
جہل ہے۔

میں اپنے پیارے وطن کا سوگ اس لئے مناتا ہوں کہ مصیبت کے
وقت گانا بے عقلی ہے۔

میں اس لئے حد سے تجاوز کر رہا ہوں کہ جو شخص حق کے ظاہر کرنے میں
اعتدال سے کام لیتا ہے وہ حق کی آدھی بات کو تو ظاہر کر دیتا ہے لیکن
باقی آدھی لوگوں کی بدگمانیوں اور اُن کی باتوں کے خوف سے پوشیدہ جاتی ہے
میں سٹری ہوئی لاش دیکھتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے
میں میرا دل بے چین ہو جاتا ہے اور میرے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ میں اس
ہاتھ میں شراب کا پیالہ اور باتیں میں مٹھائی کی ڈلی لے کر اس کے سامنے
بیٹھ جاؤں۔

اگر وہاں کوئی ایسا ہے جو میرے رونے کو منہسی میرے خوف کو رحم اور
میری افراط کو اعتدال سے بدل چاہے تو اسے چاہئے کہ وہ مجھے تمام اہل

مشرق میں کوئی ایک انصاف پسند، عاملِ شریع، راست رو حاکم بتائے
مجھے کوئی مذہبی پیشوا دکھائے جو اپنے علم کے ساتھ عمل بھی کرتا ہو اور مجھے کسی
ایسے شوہر کا پتہ دے جو اپنی بیوی کو اسی آنکھ سے دیکھتا ہو جس سے وہ اپنے
آپ کو دیکھتا ہے۔

اگر کوئی ایسا ہے جو چاہے کہ مجھے خوشی سے ناچتا اور بیل و سارنگی سے
کھیلنا ہو اور دیکھے تو اسے چاہئے کہ وہ مجھے شادی والے گھر بلائے نہ کہ قبرستان
میں کھڑا کر دے۔

ظاہر و باطن

میں نے جب کبھی کوئی کڑوا پیا یہ پائیکئی تلچھٹ شہد کی طرح شیریں نکلی۔

میں جب بھی کسی دشوار گزار گھاٹی پر چڑھا۔ بالآخر ایک سبز دار پر پہنچا۔

میں جب بھی شام کے دھندلکے میں کسی دوست کو کھو بیٹھا تو صبح کی روشنی میں اس کو دوبارہ پایا۔

لسا ادقات اجر و ثواب کے خیال سے نہیں نے اپنے آرام و مصائب

کو اظہارِ شجاعت کے پردے میں چھپایا لیکن پردہ اٹھتے ہی مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ آلامِ سسرتوں سے اور معائبِ جسم کی ٹھنڈک اور سلامتی سے بل گئے ہیں۔

ایسے ہی بہت مرتبہ میں اپنے کسی دوست کے ظاہری عادات و خصائل کو دیکھ کر اسے پرلے درجے کا احمق اور پرتوت سمجھا لیکن جب حقیقت سامنے آئی تو میں نے اپنے آپ کو خوشخوار ظالم اور اسے خوش طبع حکیم پایا۔ اسی طرح بسا اوقات خود بینی کے نشے میں مست ہو کر میں یہ سمجھتا رہا کہ میں بھڑک کر در بچہ ہوں اور میرا ساتھی خوشخوار بھڑکیا ہے لیکن جب نشے کی کیفیت اُتر گئی تو میں نے دیکھا کہ ہم دونوں انسان ہی ہیں۔

لوگو! میں اور تم صرف اپنی ظاہری حالت پر نگاہ رکھتے ہیں اور حقیقت سے آنکھیں بند کرنے کے عادی ہیں۔ اگر کسی کے قدم میں ذرا لغزش آتی ہے تو ہم پکار اُٹھتے ہیں کہ بس بزدل ہو گیا۔ اور اگر کوئی احتیاط سے چھونک کر قدم اٹھانا ہے تو ہم یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ بزدل اور جلد ہلاک ہونے والا ہے۔ اگر کوئی غور و فکر سے کام لیتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ گونا گونا جاہل ہے اگر کوئی آہ و زاری کرنے لگ جاتا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ نزع کی ہچکیاں

پس اب یہ زندہ نہیں بچ سکتا۔

ہم سبؔ من و توؔ کے ظاہری پست ہیں چھپے ہوئے ہیں۔ یہی ہے کہ روح نے جو اسرارؔ من و توؔ کے الفاظ میں پوشیدہ رکھ دیئے ہیں ہم ان کو نہیں دیکھ سکتے۔

عزور و تکبر نے ہمیں ان سچائیوں کی دریافت سے روک رکھا ہے جو ہمارے اندر پوشیدہ ہیں۔

میں تم سے کتنا ہٹوں اور ہو سکتا ہے کہ میری بات بھی ایسی ہو جو میری حقیقت کو چھپانے والی ہو لیکن میں تم سے اور خود اپنے نفس سے کتنا ہٹوں کہ ہم اپنی ظاہری آنکھوں سے جو کچھ دیکھتے ہیں اس کی حقیقت اس بادل سے زیادہ نہیں جو سامنے آکر ان چیزوں کو چھپا لیتا ہے جن کو بصیرت کی آنکھوں سے دیکھنا میرے لئے ضروری ہو اگر نہا ہے اور جو آواز ہمارے کانوں میں آتی ہے اس کی حقیقت اس گونج سے زیادہ نہیں جو اس آواز کے آڑے آتی ہے جس کو دل سے یاد رکھنا ہم پر لازم ہوتا ہے اگر ہم کسی سپاہی کو دیکھیں کہ وہ کسی آدمی کو جیل کی طرف گھسیٹ رہا ہے تو ہم پر لازم ہے کہ ہم فوراً ان دونوں میں سے صرف ایک کو مجرم نہ سمجھیں

اور اگر ہم دیکھیں کہ ایک انسان اپنے خون میں لتھڑا ہوا پڑا رہے اور دوسرے کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں تو عقلمندی یہ ہے کہ ہم فوراً ایک کو قاتل اور دوسرے کو مقتول نہ سمجھ لیں اور اگر ہم دیکھیں کہ ایک آدمی محاکمہ ہے اور دوسرا دھاڑیں مار مار کر رو رہا ہے تو ہمیں چاہئے کہ کچھ دیر انتظار کریں تاکہ معلوم ہو جائے کہ کون خوش ہے ؟

(مہجائی ! ہمیشہ کسی کی ظاہری حالت سے اس کی حقیقت کا اندازہ نہ لگایا کرو اور کسی کی بات یا کسی کے ظاہری عمل کو اس کے چھپے ہوئے اسرار کا عنوان نہ ٹھہراؤ۔ اس لئے کہ دنیا میں ایسے بہت سے انسان ہیں جن کو زبان کی تلاہٹ اور لہجے کی خرابی کی وجہ سے تم جاہل سمجھتے ہو گے لیکن اس کا وجدان ذکاوت کی ایک شاہراہ اور اس کا دلہی دلی کی جائے نزول ہوگی۔ بہت سے ایسے بھی ہونگے جن کے چہرے کی بد زبہی اور ان کی تنگدستی کی وجہ سے تم ان کو حقیر سمجھتے ہو لیکن دراصل وہ زمین پر آسمان کی عنایات میں سے ایک بخشش اور لوگوں میں خدا کی پیدا کردہ سعید روح کی حیثیت رکھتے ہونگے۔)

تم ایک ہی دھماکا عایشان محل سے مرعوب ہو جاتے ہو اور ایک

غریب کی تنگ و نا یک جھونپڑے کو رحم اور شفقت کے جذبات سے دیکھتے ہو۔
 لیکن اگر تم اس پر قادر ہوتے کہ ظاہری حالات سے جو اس کو متاثر نہ ہونے
 دیتے تو تمہارا خوف سکڑ کر افسوس کے آسمان پر چڑھ جاتا اور تمہاری شفقت
 تبدیل ہو کر جلال کے رتبے تک پہنچ جاتی۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تم اپنی زندگی کے صبح و شام میں دو مختلف
 آدمیوں سے ملتے ہو۔ ایک تم سے اس طرح مخاطب ہوتا ہے کہ اس کی
 آواز میں آندھی کی گونج ہے اور اس کی حرکات میں ایک جزار فوج کا
 رعب ہے لیکن دوسرا آدمی تم سے ڈرتے ڈرتے ہچکچاتی ہوئی آواز میں
 غیر مرتب گفتگو کرتا ہے۔ تم پہلے آدمی کو بہادر اور عزم صمیم رکھنے والا اور
 دوسرے کو ڈرپوک اور بزدل سمجھنے لگ جاتے ہو۔ لیکن اگر تم دونوں کو اس
 وقت دیکھتے جب زمانہ انہیں سختیوں کے برداشت کرنے اور کسی مقصد کے
 لئے جان دینے کو بڑھا رہا تھا تو معلوم ہو جاتا کہ کھلی بے جیا کی کا نام شجاعت
 اور خاموش جیا کا نام بزدلی نہیں ہے۔

گھر کی کھڑکی سے تھانکتے ہوئے تمہاری نگاہ سڑک کے ایک طرف
 سمٹ سمٹ کر چلنے والی پارسا عورت اور دوسری طرف اکڑ کر جانے والی

فاحشہ پر پڑتی ہے غم فوراً دل میں کہنے لگ جاتے ہو کہ یہ ایک کتنی شریف
اور وہ دوسری کتنی ذلیل ہے۔ لیکن اگر محو طری دیر کے لئے آنکھوں کو بند
کر کے دل کی آواز سننے کی کوشش کرو تو فضا کے ہر ذرہ سے کانوں میں
یہ آواز آتی کہ یہ ایک مہربانی تعریف نماز کے ذریعہ کرتی ہے لیکن وہ دوسری
تکلیف میں رہ کر بھی مجبھی سے اُمید لگائے بیٹھی ہے اور ان دونوں کی روح
میں میری روح کی جھلک نظر آرہی ہے۔

تم تمدن اور ترقی کی تلاش میں چکر لگاتے لگاتے کبھی ایسے شہر میں
داخل ہو جاتے ہو جس کے محل آسمان سے باتیں کرتے ہیں، شاندار عمارتیں
موجود ہیں۔ چوڑی چوڑی صاف سڑکوں پر لوگ ادھر ادھر جگہ بھرتے
ہیں۔ ان کی اگر کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین کو پھاڑ دینے، فضا میں
اُڑنے۔ بجلی کو اُچک لپٹنے اور ہوا سے باتیں کرنے کے خواہشمند ہیں۔ ان کے
ذوق ہرق لباس سے بول معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے لئے ع۔

ہر روز روزِ عید ہر شب شبِ برات

اسی تمدن کی تلاش میں محو طے ہی دان بعد غم کسی اور ایسے شہر
میں پہنچ جاتے ہو جس کے مکانات خستہ حالت میں ہیں جس کی گلیاں

تنگ و تاریک ہیں۔ بارش کے دنوں میں وہی مکانات کیچڑکے سمندر میں مٹی کے
 کے چیزیں معلوم ہوتے ہیں اور اگر ان پر کڑا کے کی وہ پڑتی ہے
 تو وہ گرد کے بادل معلوم ہوتے ہیں ان میں بسنے والے انسان ابھی تک بکلی
 اور سادگی کے درمیان ایسے معلوم ہونے میں جیسے کمان کے دونوں سروں
 کے درمیان ڈھیلا تار و آہستہ آہستہ چلتے پھرتے ہیں اور بہت سستی
 سے اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔ وہ تمہاری طرف بوں دیکھتے ہیں گویا ان
 کی آنکھوں کے پیچھے اور ایسی آنکھیں ہیں جو تم سے دُور کسی چیز کو گھود کر
 دیکھ رہی ہیں تم ان کے گندے شہر سے غم و غصہ کے جذبات لئے ہوئے
 نکلتے ہو اور دل میں کہتے ہو: زندگی اور موت میں وہی فرق ہے جو میں نے
 اس گندے شہر اور اس صاف شہر میں دیکھا۔ وہاں ہر چیز میں
 قوت کے آثار نمایاں نظر آتے ہیں اور یہاں ہر چیز پر ضعف اور بُزدلی
 چھائی ہوئی ہے اُدھر گرمی اور بہار کے موسم کی ہیل ہیل نظر آتی ہے اور ادھر
 خزاں اور سردی کی سی فُرمُردگی چھائی ہوئی ہے۔ وہاں پر عزم صمیم اور جوانی
 ہے جو باغوں میں ناچتی بھرتی ہے اور یہاں — کمزوری — اور بڑھاپا
 ہے جو ریت میں لتھڑا پڑا ہے۔

لیکن اگر تم اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے نور سے ان دونوں شہروں کی طرف دیکھنے کی قدرت رکھتے تو ان دونوں کو ایک باغ کے ایک ہی قسم کے دو درختوں کی شکل میں پاتے۔ اور اگر تمہاری نگاہ اور آگے بڑھ کر تمہیں ان کی حقیقت تک پہنچاتی تو تم دیکھتے کہ تمدن شہر کی بلند عمارتیں جلد مٹ جانے والے پانی کے چمکدار بلبلے ہیں اور غیر تمدن شہر کے اُجڑے ہوئے جھوٹے پوشیدہ اور پائیدار جوہر ہیں۔

نہیں۔ زندگی نظر آنے والی سطحی چیزوں کا نام نہیں بلکہ وہ پوشیدہ حقائق کا نام ہے جو ظاہری پوست سے نظر آنے والی چیز نہیں بلکہ پوست کے اندر محفوظ مغز کا نام ہے اور انسان چہروں سے نہیں بلکہ دلوں سے پہچانے جاتے ہیں۔

(اسی طرح مذہب عبادت گاہوں کا اور تعلیمی نظام کا نام نہیں بلکہ عبارت ہے اُن عقائد سے جو دلوں میں پوشیدہ رہتے ہیں اور اراکوں میں بستے ہیں۔)

اسی طرح فن اُس آواز کا نام نہیں جو مٹی کی شکل میں گانے تک پہنچائے یا جو قصیدہ خوانی کی لہروں کی صورت میں سُنی جائے۔ یہ رنگ

بڑے بکیروں کا نام بھی نہیں جو تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو۔ بلکہ فن دہ روتے
 ہوئے خاموش فاصلے میں جو گانے کے زیر و بم کے درمیان پیدا ہوتے
 ہیں۔ شاعر کی روح میں بسنے والی ناناؤں خاموشی اور مٹن جو ہر سے
 جو قصیدے کے واسطے سے کانوں تک پہنچے۔ اس حسن کا نام ہے جو حسین
 شکل کی طرف دیکھنے سے تمہیں دور رہتے ہوئے بھی اپنی طرف کھینچتا ہے۔
 بھائی! زمانہ کے لیل و نہار ظاہری رات دن کا نام نہیں دیں۔
 بل لیل و نہار کے فاصلے کے ساتھ چلنے والا انسان میری حقیقت صرف اتنی
 ہی باتوں میں پوشیدہ نہیں جو میں تمہاری سمجھ کے مطابق بیان کرتا ہوں۔
 اس لئے مجھے میری حقیقت کو آزمانے سے پہلے جاہل نہ سمجھ لو۔ مجھے
 میری اس ذات کے موجودہ تصور کو علیحدہ کرنے سے قبل تمام سے برتر
 خیال نہ کر لو۔ میرے دل کو دیکھنے سے پہلے مجھے نیل اور کجوس کہہ کر نہ پکارو۔
 اور اسی طرح میری جود و سخا کے اسباب کو معاذم کرنے سے قبل مجھے سخی
 اور فیاض منت سمجھ لو۔ میری محبت کے نور اور اس کی آگ کو اچھی طرح آزمانے
 سے پہلے مجھے اپنا دوست کہہ کر نہ پکارو اور میرے رستے ہوئے ناسور کو
 اچھی طرح چھپتے بغیر مجھ پر یہ الزام بھی نہ لگاؤ کہ میرا دل محبت سے خالی ہے۔

ممالک عربیہ کی بیداری

سوال :- آپ کے خیال میں ممالک عربیہ کی بیداری کسی ایسی مضبوط بنیاد پر قائم ہے جس کی وجہ سے یہ دائمی صورت اختیار کرے گی یا یہ ایک وقتی جوش ہے جو بہت جلد ختم ہو جائیگا۔

جواب :- میرا خیال تو یہ ہے کہ ممالک عربیہ کی موجودہ بیداری ایک مدغم سی صدائے بازگشت سے زیادہ نہیں جو جدید مغربی تمدن کی پیداوار ہے اور یہ اس لئے کہ اس بیداری نے خود عربی ممالک میں کوئی نئی چیز پیدا نہیں کی اور نہ ہی اپنی ان خصوصیات کو ظاہر کیا ہے۔ جو صرف ان ممالک سے مختص ہیں

وہ اسفنج جو باہر سے مھوڑا سیاہی مستعار لے کر پھول جاتا ہے کبھی پانی کے بہتے ہوئے چشمتے میں تبدیل نہیں ہوتا لیکن جو شخص یہی سمجھتا ہے کہ اسفنج میں سے چشمہ پھوٹتا ہے تو اُسے راقم الحروف کے اجتماعی نظریوں کی نسبت کسی حکیم کی جڑی بوٹیوں کی زیادہ ضرورت ہے۔

دو سمندروں کے درمیان پھیلا ہوا وسیع و عریض مشرق آج کل مغرب اور اہل مغرب کی نوآبادی بن گیا ہے لیکن مشرق کے باشندے وہ باشندے جو اپنے ماضی پر فخر کرتے ہیں جو اپنے آثار پر اکڑتے ہیں اور اپنے آبا و اجداد کے کارناموں ہی کو فخر سے یاد کرنے رہتے ہیں، ان کے افکار اہل مغرب کے افکار ان کے میلانات مغرب کے میلانات اور ان کے جذبات اہل مغرب کے جذبات کے خوشہ چیں بن کر رہ گئے ہیں۔

ہیں مغربی تمدن کی خوبی یا اس کی خرابی سے بحث نہیں۔ اس لئے کہ مغربی تمدن ۱۹۱۷ء میں آپ ہی قضاہ خداوندی کی لپیٹ میں آیا تھا ہے معلوم یہ ہوتا ہے کہ دائمی طور پر وہ اسی لپیٹ میں رہ گیا۔ اگر قضاہ خداوندی مغربی تمدن کا فیصلہ سنانے کے لئے مجھے اپنا تائب بناتی دیں الیہا فیصلہ سنانا اور مغرب کے اکثر مفکرین کے فیصلہ سے میرا فیصلہ اتفاق نہ کرنا۔

اس وقت بحث یہ ہے کہ کیا ممالکِ عربیہ میں بیداری پیدا بھی ہوتی ہے یا نہیں اور یہ کہ ”بیداری“ کے لفظ کے کون کو کسے معنی ہو سکتے ہیں اور ہر معنی کے اعتبار سے اس سے کیا کیا نتائج منترتب ہوتے ہیں۔

اگر ”بیداری“ کسی استاد کی شاگردی اور شاگرد کے سطحی اقتباس کا نام ہے تو اس لحاظ سے ممالکِ عربیہ میں اس وقت بیداری پیدا ہو چکی ہے۔

اگر ”بیداری“ بوسیدہ کپڑوں میں پونہ لگانے کا نام ہے تو ممالکِ عربیہ کو اس لحاظ سے تمام ممالک پر فوقیت حاصل ہے۔

اگر ”بیداری“ اس کا نام ہے کہ کوئی جماعت دوسروں کا انازا تو ابیکار لباس پہن لے تو ممالکِ عربیہ اس مقصد کو حاصل کر چکے ہیں۔

اگر ”بیداری“ سیاہ چیز پر سفید رنگ چڑھانے، گرتی ہوئی عمارت کو چرنا لگانے اور مسمار شدہ کھنڈر کی مرمت کو کہتے ہیں تو ممالکِ عربیہ شرافت اور سرملندی کے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچ چکے ہیں۔

اگر ”بیداری“ اس کا نام ہے کہ ہم حبالہ کی خور دہین لگا کر چینہ ٹی کو ہاتھی اور مچھر کو ادنٹ سمجھیں تو ممالکِ عربیہ یقیناً بیداری کی دولت سے مالا مال ہو چکے ہیں۔

اگر بیداری اس کا نام ہے کہ اعلیٰ نصب العین سے اس لئے مٹنے
 پھیر لیں کہ اس کا حاصل کرنا دشوار ہے اور صبر و رضا کی زندگی اختیار کر لیں۔
 اس لئے کہ یہی آسانی کا راستہ ہے تو ممالک عربیہ زمانے کے انقلابات سے
 محفوظ ہو چکے ہیں۔

لیکن اگر بیداری ایجاد و اختراع کا نام ہو تو ماننا پڑے گا کہ ممالک عربیہ
 اس وقت بھی خواب غفلت میں ہیں۔

اگر بیداری ”روح اور انسانی جوہر کی بیداری کا نام ہے تو ممالک عربیہ
 کی روح اور ان کا جوہر اس وقت اسی منزل پر ہے جس پر وہ آج سے
 ایک ہزار سال قبل تھا۔

اگر بیداری ”حقیقی بیداری“ باطنی معرفت اور خاموش شعور کا نام ہو
 تو مشرق ابھی اٹھا نہیں اس لئے کہ وہ کبھی گڑا ہی نہیں۔ قدرت کے وہ فن
 خزانے جن کی کھدج نکالنے کی کوشش انہی ممالک نے کی وہ مفقود
 نہیں ہوئے بلکہ خود انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ موتیوں کا وہ درخت
 جس کو مشرق نے اپنی پاک مٹی میں لگایا اور اسے اپنے آنسوؤں اور اپنے
 غن سے سیراب کیا اس کی شاخیں اب بھی سرسبز اور مچھلیں سے لدی ہوئی

میں مگر مشرق نے اپنا رخ اس سے پھیر لیا اور دوسرے درخت کے سائے میں آگیا۔

اگر یہ ہو سکتا کہ ہم تھوڑی دیر کیلئے تنہائی کی کسی بلند چوٹی پر چڑھنے اور ماضی کے واقعات ہمارے سامنے ایک ایک کر کے گزرتے تو ہم دیکھتے کہ قوموں کی بیداری اور ان کی ترقی ان کارناموں سے نہیں ہوتی جو انہوں نے صرف اپنے اپنے نفع کے لئے سرانجام دیئے اور جن کے ذریعہ انہوں نے صرف اپنے ممالک اور حدود کی عظمت بڑھائی بلکہ ترقی ان کارناموں کی وجہ سے نئی جو بعید میں آنے والی تمام قوموں کے لئے بطور یادگار باقی رہے۔ زمانے کا وہ نچوڑ جس کی صبح بابل میں اور شام نیویارک میں ہو اس کا پس منظر وہ خفالت ہیں جن کو انسانوں نے دریافت کیا اور جو تمام انسانی افراد کیلئے عام تھے ان کا سرچشمہ وہ مجالِ مطلق ہے جس کو انسان نے دیکھا، اسے ایک لاجواب قلاب میں ڈھالا اور آخر سونے کے لاکھ کی صورت میں سورج کے سامنے لاکھڑا کیا۔ اگر ہم روحانی بیداری کا ذکر کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ موسیٰ (علیہ السلام) بنی اسرائیل کی بیداری تھی، عیسیٰ (علیہ السلام) ہمیشہ بیدار تھے اور بیدار رہے۔ بدھ ہندوستان کی بیداری تھی۔ بدھ بیدار

تھا اور بیدار رہا۔ یسوع مسیح علیہ السلام ان لوگوں کی بیداری تھی جن کی
 نیکوئی قومیت تھی اور نہ ہی کوئی وطن اور نہ ہی کوئی دین اور نہ ہی کوئی
 اور بیدار رہے۔ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم عرب کی بیداری تھی اور وہ
 ہمیشہ بیدار تھے اور بیدار رہے۔

اگر ہم فن و ادب کی طرف میلان رکھتے ہوں — اور فن و ادب کا
 درجہ دین کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسا شرح کا متن سے — تو ان
 آسمانی بیداریوں کے اشارے ہیں لجن داؤدی ہیں، ایوب کی کتاب ہیں،
 ہندی حکایات ہیں، چینی ضرب الثقلوں ہیں، حضرت علی کے مقبولوں ہیں،
 غزالی کے نظریات ہیں، ابن فارض کے کلام ہیں، معری کے فلسفے ہیں،
 ڈینٹے (DANTE) کے خیالوں ہیں، میکلائیکلو (MICHAEL ANGELO)
 اور شکسپیئر (SHAKESPEARE) کے ڈراموں میں کھلے طور پر چھپتے ہوئے نظر
 آتے ہیں۔

اگر ہم علوم فلسفہ میں غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ باوجود اس کے کہ ہر
 دور اپنے پیش رو زمانے کی یادگاروں کو گرا دینے کی کوشش کرتا ہے پھر
 بھی ان میں سے اتنا حصہ ضرور باقی رہ جاتا ہے جس سے انسانی افراد

مستفید ہوتے ہیں لیکن جب ہم جالینوس سے لے کر لسترٹیک، اقلیداس سے لے کر آئن سٹائن تک اور یعقوب کندی سے لے کر پاسٹر تک ان تمام افراد کی حقیقت تلاش کریں جو علوم طبیعیہ اور علوم فلسفییہ میں منہمک رہے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان میں کا ہر فرد اپنے جماعتی فہم میں پوشیدہ عزم کا ایک مجسمہ تھا کسی دوسری جماعت کی عقلیت میں لرزنا ہوا سایہ ہرگز نہ تھا۔

ان باتوں سے معلوم ہوا کہ بیداری کا دارد مدار اپنی اصل پر ہوا کرتا ہے۔ اس سے بھڑی ہوئی شاخوں پر نہیں۔ اس کا جو ہر ثابت ہوا کرتا ہے بدلتے ہوئے اعراض پر نہیں۔ امام کے ذریعہ حاصل کی ہوئی زندگی کے اسرار پر ہوا کرتا ہے۔ وقتی لذتوں سے متعلق فکری تخیلات پر نہیں ایجاد کنندہ روح پر ہوا کرتا ہے۔ تقلیدی ہمارت پر نہیں۔ اس لئے کہ روح صحیح باقی رہنے والی چیز ہے اور روح کی بیان کردہ حقیقت بھی۔ لیکن تقلیدی ہمارت صاف شدہ اور جلد مٹ جانے والے چھلکے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور اس کے صاف شدہ چھلکے پر جو بھی عکس ڈالا جائیگا۔ وہ خیالی چیز کی طرح مٹ کر فنا ہو جائیگا۔

اگر یہ ساری باتیں ماننے کے قابل ہیں — اور ضرور ہیں —

تزمیرے خیال میں یہ بات صاف ظاہر ہو گئی۔ کہ ممالکِ عربیہ کے متعلق اُس وقت تک بیداری کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ ان کی بیداری کا دار و مدار جدید مغربی تمدن کی تقلید پر ہے۔ وہ مغربی تمدن جس کو خود اس کے عقلمند فرزند بھی مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں اور اس کے اکثر مظاہر کو ناپسندیدہ لگا ہوں سے گھورتے ہیں۔

لیکن جب ممالکِ عربیہ اس کو ری تقلید سے باز آ کر اپنی خاص قوتوں کو بیدار کر لیں۔ کہ باندھ کر اپنے قدیم پوشیدہ خزانوں کے سامنے آکھڑے ہوں تو اُس وقت وہ حقیقت میں بیدار ہوں گے۔ ان کی بیداری مضبوط بنیادوں پر قائم ہوگی اور وہ فوری جو شس نہیں ہوگا جو جلد مٹنا پڑ جاتے۔

سوال :- کیا آپ کی رائے میں ممالکِ عربیہ کا ایک دوسرے سے متفق ہونا ممکن ہے اور اگر ہے تو کب تک اور کن کن اسباب سے؟ اس اتحاد میں زبان کا حصہ کیا ہوگا؟

جواب :- یہ سوال سیاسی عروج سے متعلق ہے حقیقی عروج ہے اس کا تعلق کوئی نہیں پھر بھی اس کا جواب دینے میں کوئی حرج نہیں

میری داسے یہ ہے کہ موجودہ دور میں ممالک عربیہ کا متحد ہونا ممکن نہیں۔ اس لئے کہ مغربی فکر اس بات کا قائل ہے کہ طاقت کا زور حق سے زیادہ ہے اور وہ قوت اپنی سامراجی اور سرمایہ دارانہ مفاد کو ہر چیز پر مقدم رکھتی ہے جب تک اس قوت کے پاس ہر اس طاقت کو ختم کرنے کے لئے منظم فوجیں اور بڑی بڑی توپیں موجود ہیں۔ جو اس کے سامراجی مصالح یا اقتصادی ارادوں میں حائل ہو۔ اس وقت تک یہ اتحاد ناممکن ہے اور ہم میں سے ہر ایک جاننا ہے کہ یورپ کی تمام قوتیں لڑاؤ اور حکومت کر دہ کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں اور دنیا کی بد بختی، مشرق اور مغرب کی عمومی بد بختی بھی ہے کہ توپیں افکار سے زیادہ قوی ہو گئی ہیں اور سیاسی جیلے محتال کی نسبت زیادہ مؤثر بن گئے ہیں۔

آخر ممالک عربیہ کا اتحاد کیسے ممکن ہے جب کہ ان کے ایک ایک ملک کا مرکز حرکت اور اضطراب میں تو ہے مگر یہ اضطراب یورپین دار الخلافوں میں سے کسی ایک دار الخلافہ کی ہدایت کے مطابق ہوتا ہے اور وہ آپس میں متحد کیونکر ہو سکتے ہیں جب کہ ہر ملک اپنی سیاسی، عمرانی اور اقتصادی نظریات میں مغرب کی کسی بعید گوشے کے اشاروں کو دیکھتا رہتا ہے۔

جب ممالک عربیہ کا کوئی ملک چاہے کہ وہ سیاسی اعتبار سے کسی اور کے حصہ ملک سے مل جائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس سے کچھ لے اور اسے کچھ دے اور اگر چاہے کہ انتظامی اعتبار سے اس سے مل جائے تو اس پر لازم ہے کہ اسے اپنے قریب کر دے اور خود اس کے قریب ہو جائے اور اگر چاہے کہ اس سے اقتصادی امداد حاصل کرے تو اس کا فرض ہے کہ اور ممالک کے ساتھ اسی ملک کے تبادلہ کو ترجیح دے۔ مجھے کوئی بتا سکتا ہے کہ کیا عربی ممالک میں ان ابتدائی باتوں کو بھی کوئی سمجھ چکا ہے۔

ایسی ابتدائی باتیں نہ اتحاد کے راستہ میں بہت زیادہ معمولی حیثیت رکھتی ہیں۔ میں نہ کہتا ہوں کہ یہ ممالک ابھی ان ابتدائیات سے بھی نا آشنا ہیں اور میں اسی لئے کہتا ہوں کہ ان ابتدائی باتوں کے بعد اس سے زیادہ گہری اور زیادہ مزید باتوں سے بھی ان کو اطلاع حاصل کرنی پڑے گی۔

مجھے عربی ممالک کے سمجھدار لوگوں میں سے کوئی بتا دے کہ کوئی بھی شامی لیں دین کے معاملے میں کسی مصری کو یورپین پر ترجیح دیتا ہے ؟ اور کوئی بھی مصری اس بات کو پسند کرنا ہے کہ یورپ کے باشندوں کو چھوڑ کر مصریوں کے قریب آئے اور کیا حجاز، یمن یا عراق کے رہنے والے عربی

کو یہ بات پسند ہے کہ وہ مغرب کے باشندے سے پہلے کسی مصری یا شامی سے معاملہ کرے ؟

مجھے دنیا کا کوئی عاقل یہ بتا دے کہ کیا اقتصادی اتحاد بلکہ اقتصادی استقلال سے پہلے سیاسی یا غیر سیاسی اتحاد ممکن ہے ؟

اور اس کے بعد عرب کے مفکرین، امراء اور عوام کے لیڈر مجھے یہ بتائیں کہ کیا وہ واقعی ممالک عربیہ کی بیداری، ان کے اتحاد اور ان کے استقلال کے خواہشمند ہیں۔ جب کہ انہوں نے اس راستے میں اپنی ناقابل فہم اور ناقابل عمل رایوں کے سوا ابھی تک کچھ بھی نہیں کیا۔ اور اگر ان کے خاص اعمال، ان کے ذاتی افعال اور ان کی روزمرہ زندگی پر نظر ڈالی جائے تو صاف نظر آئے گا کہ وہ اپنے ارادوں اور اپنے دعووں کے خلاف چل رہے ہیں۔ وہ مغربی برتنوں میں کھاتے ہیں۔ مغربی پاپیوں سے پیتے ہیں۔ مغربی لباس پہنتے ہیں۔ مغربی ٹیکسوں پر سوار کھڑے سوتے ہیں اور یہاں تک کہ جب مرتے ہیں تو ان کا کفن تک مغرب کے کارخانوں سے ہُن کر آتا ہے۔

کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ قومی رہنما اور سیاسی مفکر جب میرے

پاس ممالک عربیہ کے معاملات پر گفتگو کرنے آتا ہے تو کسی نہ کسی مغربی زبان میں گفتگو کرنے لگ جاتا ہے۔

کیا رونے کا مقام نہیں کہ مجھے اس لئے اپنے گھر بلایا جاتا ہے کہ مجھے اس کی تہذیب — مغربی تہذیب یافتہ — بیوی کے سامنے سرودق کھڑے ہونے کا شرف حاصل ہو؟

کیا دل کے خون ہونے کا واقعہ نہیں کہ میں اس کے دسترخوان پر بیٹھا ہوں اور اس کی حسین لڑکی مجھ سے شویان کے گیتوں کا تذکرہ کرتی ہے اور اس کا ادیب لڑکا میرے سامنے ڈی مو سے کے قصائد پڑھتا ہے۔ جیسے کہ ہوا کے ساتھ اڑنے والی روح۔ اور گویا کہ اس نے مجھ کو انشرف رضی اور ابن زریق سے متعلق کبھی گفتگو ہی نہیں کی۔

ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے مجھے کیوں اس بات پر غصہ نہیں آتا کہ یہی سیاسی لیڈر مجھے مستقبل کے وسیع میدان میں لے جا کر مجھ سے یہ توقع رکھتا ہے کہ اس کی سیاسی باتوں کو بلاچون و چرا تسلیم کر لوں۔ جب وہ ممالک عربیہ کے انتخاب اور اس کے اقتصادی استقلال کی تباہ و بربادی سے منہ پھیر کرے۔

اگر یہی سیاسی لیڈر جو ایک ہی وقت میں دو کشتیوں پر سوار رہتا ہے مجھ سے منہس کر بھی کتنا کہ مغرب آگے بڑھ چکا ہے ہم اس کے پیچھے پیچھے جانے والے لوگ ہیں۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ آگے بڑھنے والے کے نقش قدم پر چلیں اور حرکت کرنے والے کے ساتھ ساتھ ہم بھی حرکت کریں۔ تو میں اسے یہی جواب دیتا ہوں۔ تم اچھا کر رہے ہو۔ تم بیشک آگے نکلے ہو۔ تم نے پیچھے لگ جاؤ لیکن خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے جاؤ۔ چلنے والے کے نقش قدم پر چلو اور یہ چھوٹے دعوے نہ کیا کرو کہ تم اس کے پیچھے نہیں جا رہے ہو۔ آگے حرکت کرنے والے کے ساتھ بیشک حرکت کرو لیکن اپنے پیشرہ کا اخلاص دل میں رکھو۔ چھٹے ہوئے سیاسی پردوں کی بنیاد میں اس بات کو چھپانے کی کوشش نہ کرو کہ تم اس کے محتاج ہو اور پھر معمولی معمولی باتوں میں اتحاد و اتحاد کی رٹ لگانے کا فائدہ کیا ہو گا جبکہ تم اصول میں متحد نہیں ہو سکتے۔ افکار کا اتحاد تمہیں کیا نفع پہنچا سکتا ہے جب کہ تمہارے اعمال متحد نہیں ہیں کیا تم نہیں جانتے کہ جب تم رات کو سو کر ساری ساری بات اتحاد و اتفاق، خبسی اجتماع اور لسانی روالہ کے خواب دیکھتے رہتے ہو اور صبح اٹھتے ہی لینے بچوں اور اپنی بچیوں کو اہل مغرب کے سکولوں

میں انہیں کے اُستادوں سے انہیں کی کتابیں پڑھنے کے لئے بھیجتے ہو تو مغرب کے باشندے تمہارا مذاق اڑاتے ہیں؛ کیا تم اس سے بے خبر ہو کہ مغرب کے رہنے والے اس وقت تم پر ہنستے ہیں جب تم سیاسی اور اقتصادی اتحاد سے رغبت کا اظہار کرتے ہو۔ باوجود اس کے کہ انہیں کے پاس جا کر ان سے درخواست کرتے ہو کہ وہ اس سوئی کے بدلے میں جس سے تم اپنے بچوں کے کپڑے سینے ہو اور اس کیل کے بدلے میں جو تم اپنے مردوں کے ثوابت میں ٹھونکتے ہو۔ تمہاری زمین کی کچی پیداوار کو قبول کریں۔

یہ میں اُس سے کہتا ہوں جو ذرا خوش طبعی سے میری باتیں سُنتا ہے ان بہروں کے سامنے جو اور تو کیا خود اپنے دلوں کی آواز تک کو نہیں سُن سکتے۔ یہ خاموش رہنا ہی بہتر سمجھتا ہوں۔ ان کے لئے میرے دل میں رحمت و شفقت کے جذبات ہیں مگر جس طرح مجھے ان کے کانوں سے کوئی حصہ نہیں ملتا اسی طرح میری آوازیں ان کا کوئی حصہ نہیں۔

ان تمام باتوں سے، سلبی صورت میں، وہ بات ظاہر ہو گئی جس میں ممالک عربیہ کے اتحاد اور ان کے استقلال کے لئے سب سے زیادہ مؤثر سمجھتا ہوں — ایجابی صورت میں اس کے لئے دو بنیادی اصول ہیں۔ پہلا

اُصول یہ ہے کہ قوم کے بچوں کو خالص قومی مدارس میں تربیت دی جائے اور ان کو عربی زبان میں علوم و فنون کی تعلیم دی جائے۔ اس سے معنوی محبت اور روحانی استقلال حاصل ہوگا۔ دوسرا اُصول یہ ہے کہ زمین کو زیادہ سے زیادہ زرخیز بنا کر اس سے پیداوار حاصل کی جائے اور اس پیداوار سے مشرقی صنّاعی کے ذریعے ایسی اشیاء دنیا کی جائیں جن کی قوم کو ضرورت ہے یعنی مشرقی لباس مشرقی خوراک اور مشرقی مکان وغیرہ۔ اس سے اقتصادِ متحدہ پیدا ہوگا اور یہ ہوتے ہوئے ممالکِ عربیہ سیاسی استقلال سے مالا مال ہوں گے۔

سوال :- کیا ممالکِ عربیہ کیلئے یہ مناسب ہے کہ وہ مغربی تمدن کے عناصر کو حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اگر ہے تو کہاں تک؟ اور کس مقام پر پہنچیں اس سے فائدہ اٹھائیں؟

جواب :- میرا خیال ہے کہ مغربی تمدن کو حاصل کرنا یا نہ کرنا محلِ بحث نہیں سوال دراصل یہ ہونا چاہئے کہ مغربی تمدن کو حاصل کرنے کے بعد مشرق اس کے سانچہ کیا کرے؟

میں نے تین سال ہوئے یہ کہا تھا کہ مغرب کے باشندے گزشتہ دور میں ہماری پکی ہوئی چیزیں لے کر چلے گئے تھے اور اس کے کام آنے والے اجزاء کو مغربی شکل میں بدل دیتے تھے لیکن آج کا مشرق مغرب کی پختہ غذا کو لے کر نکل جاتا ہے۔ وہ غذا کو مشرقی شکل میں بدل دینے کی جگہ خود مغربی شکل اختیار کر جاتا ہے اور یہ ایسی حالت ہے جس سے میں بہت زیادہ ڈرتا ہوں۔ اس لئے کہ مجھے کبھی تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشرق وہ مردِ ضعیف ہے جس کے سارے دانت گر چکے ہیں اور کبھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ بچہ ہے جس کے دانت ابھی نکلے نہیں۔

میں نے اپنے آخری تین سالوں میں بیشمار خیالات کو خیر باد کہا۔ لیکن یہ خیال ہر وقت میرے دل میں کھٹکتا رہا اور کھٹک رہا ہے جس طرح پہلے اس خیال کے آتے ہی میں ڈر جایا کرتا تھا اب بھی اسی طرح ڈرتا ہوں بلکہ اب تو ایک ایسی حالت سامنے آئی ہے جو بہت زیادہ خوفناک اور مایوس کن ہے اور وہ یہ کہ ان ایام میں یورپ تو امریکہ کی تقلید کرنے اور اس کے نقش قدم پر قدم رکھنے لگا ہے مگر مشرق ابھی یورپ ہی کی تقلید کر رہا ہے اور اس کی طرف رخ کئے بھاگا جا رہا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مشرق

ایک امام کی تقلید نہیں کر رہا بلکہ وہ کئی مقلدوں کی تقلید میں مصروف ہے۔
 اب کئی سائے اس پر پڑ رہے ہیں۔ یاؤں سمجھو کہ مشرق کا اسفنج وہی پانی
 اپنے پیٹ میں ڈال رہا ہے جو اس کے پاس دوسرے اسفنج سے نکل کر آتا
 ہے اور یہ انتہائی کمزوری اور دوسروں پر اندھا دھند بھروسہ کرنے کی آخری
 حد ہے بلکہ انتہائی حماقت اور اندھا پن ہے۔ اس لئے کہ مشرق کے باشندے
 دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے والے سائل کے سامنے ہاتھ پھیلا رہے

ہیں۔

اگر مشرق کے باشندوں کے لئے یہ ممکن ہوتا کہ وہ ان چیزوں کو حاصل
 کر لیں جن سے وہ بے خبر ہیں بشرطیکہ وہ چیزیں ان کی اپنی معلومات کے لئے
 ذہن بلا ہل کا کام نہ دیں تو سب سے پہلا شخص میں ہی ہوتا جو مشرق کو اس کی
 طرف بلاتا۔ اگر مشرق کا باشندہ اس بات کی قدرت رکھتا کہ وہ دوسروں سے
 وہ تمام چیزیں عاریت پر لے جن کی اسے ضرورت ہے۔ لیکن ان
 کو اپنی معلومات کی قبر بنائے تو میں اس اخذ اس حصول اور اس نقل کو
 اچھا سمجھتا۔

لیکن غور کرنے کے بعد مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ مشرق کے باشندوں

کے نفس میں قیام پذیرائی باریک تاروں والی سازنگی ہے جس کے ہر تار کی آواز مغربی سازنگی کے تاروں کی آوازوں کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے اور مشرق کا باشندہ ان دونوں متضاد آوازوں کو ایک جگہ جمع کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ بغیر اس کے کہ وہ کسی ایک آواز کو یاد دونوں کو بیکار نہ کر دے۔

ہم بسا اوقات سطحی نگاہ رکھنے والوں کو یہ دلیل پیش کرتے ہوئے سنتے ہیں کہ جاپان نے مغربی تمدن کی روشنی حاصل کی اور اسی وجہ سے وہ کامیاب ہوا۔ آگے بڑھا اور اس کی شان یہاں تک بلند ہوئی کہ وہ دنیا کی اوجھنی توہوں کی صف میں کھڑا نظر آ رہا ہے۔

لیکن جاپانی مفکرین جاپانی اہل الرائے اور جاپانی ادیبوں کی نظر میں جاپان نے اپنے مخصوص تمدن کو اسی وقت خیر یاد کہا جب وہ مغربی تمدن کی نقل اُتارنے لگا۔ وہ کہتے ہیں کہ جاپانی قوم نے اپنی عقیدت اپنا سلیقہ اپنے اخلاق اپنے فن اپنی صنعت اور یہاں تک کہ اپنے قلبی سکون و اطمینان کو اسی وقت رخصت کیا جب کہ وہ یورپ اور امریکہ کی تقلید کرنے لگا۔ وہ کہتے ہیں کہ جاپان کی فوجی کامیابیاں حقیقت میں کامرانی نہیں بلکہ نہایت ذلیل معنوی شکست تھی اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان آلات جنگ نے جاپانی تمدن

کے مفید اور بہتر حصے کو ختم کر کے رکھ دیا ہے جن کے تیار کرنے کی صنعت جاپان نے جرمنی اور امریکہ سے سیکھی اور اس صنعت کا پھیل ان کو بد اخلاقی، بزدلی اور کمینہ پن کے سوا کچھ نہ ملا۔

ہمارے قدیم وطن — مشرق — میں لامحدود ذخیرے اور خزانے موجود ہیں لیکن وہ بکھرے پڑے ہیں اور گرد و غبار کے پردوں سے پوشیدہ ہیں اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مغرب کے باشندوں نے فن ترتیب کو انتہائی درجہ تک پہنچا دیا ہے اسی وجہ سے اگر وہ اپنے عجیب کو بھی مرتب کر کے پیش کرتے ہیں تو وہ بھی اچھے نظر آتے ہیں اور اگر وہ اپنی بھالائیوں کو ترتیب دے کر پیش کرتے ہیں تو وہ معجزات نظر آتے ہیں۔ پس اگر ہم ان سے کچھ نہ کچھ روشنی حاصل کرنا ضروری ہو تو ہمیں چاہئے کہ ہم ان سے یہی فن سیکھ لیں لیکن اس شرط پر کہ اس کے سوا ہم ان کی کسی اور بات کی تقلید نہ کریں۔

نفس

سب سے بڑے معبود نے اپنی ذات سے نفس کو علیحدہ کیا اور اس کو جمال سے بھر دیا۔

اسی معبود نے اس نفس کو نسیمِ سحر کی بیداری، نمازِ شگفتہ، کلیوں کی مہک، اور چاندنی کے لطیف نور سے مالا مال کیا۔

اسی معبود نے اس نفس کو ایک جامِ شراب عطا کرتے ہوئے کہا: "اُس جامِ شراب کو صرف اس وقت پیو۔ جب تم ماضی کو فراموش کر دو اور مستقبل سے بے فکر ہو جاؤ۔ اور غم کا ایک اور پیالہ دیتے ہوئے کہا: "اور جب کبھی

اس شراب کو پیو گے۔ تمہیں زندگی کی حقیقی مسرت حاصل ہوگی۔
 پھر اس نفس کی رگ رگ میں محبت کا وہ خون دوڑایا جو استغناء
 کی پہلی سانس کے ساتھ ختم ہو جایا کرتا ہے اور ایسی مستی اس میں بھر دی
 جو غرور کے پہلے حملے کے ساتھ اُڑ جایا کرتی ہے۔

اس کو ایسے ملکوئی علم سے مالا مال کیا جو اسے سچائی کی راہوں پر لگانا
 ہے اور اس کے دل کی گہرائیوں میں ایسی بصیرت پیدا کر دی جس سے وہ
 نظر آنے والے حقائق کا مشاہدہ کرتا ہے۔

اس میں رجم کے ایسے جذبات بھر دیئے جو خیالات کے ساتھ بہتے
 ہیں اور سالیوں کے ساتھ چلتے ہیں۔

اسے ایسا لباس پہنایا جسے فرشتوں نے قوس قزح کے رنگین روبر
 سے تیار کیا تھا۔

پھر اس میں حیرت کی تار بکلی جو حقیقت خیال کی رشتی ہے بھٹی کھدی
 اسی محبوب نے غضب کی بھٹی سے آگ کے چند شعلے جہالت کے صحرا
 میں اُڑتی ہوئی آندھیوں کی ہوا، غرور کے سمندر کے کنارے پڑی ہوئی
 ریت کی ایک مٹھی، انسان اور زمانے کے قدموں کے نیچے پڑی ہوئی خاک

کو اٹھایا۔

ان سب کو ملا کر ایک مجموعہ تیار کیا جسے ایسی اندھی قوت عطا کی جو
جنون کے وقت بھڑک اٹھتی ہے اور شہوانی خیالات کے ساتھ ٹھنڈی پڑ
جاتی ہے۔

اس مجموعہ میں زندگی کی رُوح — یعنی موت کا خیال پھینک دیا۔
یہ سب کچھ کرنے کے بعد عبید بنہسا اور زدیا۔ اس نے لا انتہا اور غیر محدود
محبت کا احساس کیا اور اس احساس کے جذبے کے ماتحت اس نے اس
انسان اور اُس نفس کو یکجا کر دیا۔

رحم کر! میرے نفس!

میرے نفس! میری کمزوری کو جانتے ہوئے آخر تو کب تک رہیگا؟
تُو اچھی طرح جانتا ہے کہ میرے پاس تیرے خوابوں کی تعبیر کے لئے انسانی
کلام کے سوا اور کوئی زبان نہیں تو پھر تو کب تک چلائے گا؟
میرے نفس دیکھ! میں نے اپنی ساری زندگی تیری ہی تعلیمات کو
سُننے سُننے گزار دی۔

مجھے دکھ دینے والے نفس غور کر! تیری وجہ سے آئی ہوئی معیتیں سہتے
سُننے میں نے اپنا جسم ضائع کر دیا۔

میرا دل میری ملکیت تھی لیکن اب بڑا تیرا غلام ہے۔ میرا صبر میرا
 غمگسار تھا، اب وہ تجھ سے مل کر مجھے طعنے دے رہا ہے۔ شباب میرا ساتھی
 تھا، اب وہ مجھے ملامت کر رہا ہے اور میں جانتا ہوں کہ سارے معاصی
 خدا ہی کی طرف سے ہیں۔ اب تو اس سے بڑھ کر اور کیا چاہتا ہے۔ مجھ
 میں باقی کیا رہ گیا ہے جس کو چھین لینے کے درپے ہے۔

تُو نے میری ذات کا انکار کیا۔ تُو نے میری زندگی کی پناہ گاہ کو
 بے یار و مددگار چھوڑا۔ تُو نے میری عمر سے بے وفائی کی اور اب تیرے
 سوا میرا کوئی نہیں۔ خدا کے لئے اب میرے ساتھ انصاف کر۔ انصاف میں
 ہی تیری زندگی ہے۔ اگر یہ نہیں تو پھر موت کو پکار اور اپنی حقیقت کو جسم
 کے اس قید خانے سے آزادی دے دے۔

اے نفس مجھ پر رحم کر! تُو نے محبت کا وہ بھاری بوجھ میرے اوپر ڈال
 دیا ہے جس کے اٹھانے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ تُو اور محبت ایک متحد قوت
 ہو لیکن میں اور مادہ متفرق کمزوری۔ کیا قوی اور کمزور کا یہ معرکہ اس طرح طویل
 پڑتا جائیگا؟

اے نفس مجھ پر رحم کر! تُو اور سعادت پہاڑ کی بلندی چوٹی پر تھے۔ تُو

نے دُور سے مجھے سعادت کی جھلک دکھائی۔ محبوب کو میں اپنی بدبختی کے ساتھ
 وادی کی گہرائیوں میں کھڑا تھا۔ کیا بلندی اور پستی کی ملاقات ممکن ہے؟
 اے نفس! مجھ پر رحم کر! تُو نے جمال کی جھلک دکھا کر اسے چھپا دیا۔
 تُو اور جمال دُور میں ہو لیکن میں اور جہالت تاریکی میں۔ کیا نور اور تاریکی آپس
 میں مل سکتے ہیں؟

اے نفس! تو آخرت کے آنے سے قبل اس کا نام سُن کر خوشیاں
 مناتا ہے۔ لیکن یہ جسم زندہ رہتے ہوئے بھی اپنی زندگی کی وجہ سے بدبخت ہے،
 تُو بقا کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ لیکن یہ جسم فنا کی طرف
 بھی بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا ہے۔ نہ تُو رکتا ہے اور نہ یہ تیزی سے
 قدم اٹھاتا ہے۔ اے نفس! یہ کتنی بدبختی ہے؟

تُو آسمان کی کشش سے بلندی کی طرف اُڑ رہا ہے۔ لیکن یہ جسم زمین
 کی کشش سے پستی کی طرف گرتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن نہ تو اس کی مدد کرتا ہے اور
 نہ یہ تجھے مبارکباد دیتا ہے۔ کیا یہ انتہائی افسوس کا مقام نہیں؟

اے نفس! تُو اپنی حکمت کی وجہ سے بے نیاز ہے۔ لیکن یہ جسم اپنے
 سابقہ کی وجہ سے ہر ایک کا محتاج ہے۔ لیکن نہ تُو تساہل سے کام لیتا ہے

اور نہ ہی یہ تیری قیادت کو تسلیم کرتا ہے۔ یہ کتنی نامرادی ہے؟
 تو رات کے سکون انجیولحات میں محبوب کی طرف جاتا ہے۔ اس سے
 مل کر اور گلے میں بائیں ڈال کر لطف اندوز ہوتا ہے۔ لیکن یہ جسم ہمیشہ
 قن کا قاتل رہتا ہے۔
 اے نفس رحم کر! خدا کیلئے رحم کر!

ملاقات

حیب رات نے آسمان کی چادر میں ستاروں کے موتی ٹکالنے کا کام
 ختم کر لیا۔ اُس وقت نیل کی یاد می سے دکھائی نہ دینے والے پردوں کو،
 پھٹ پھڑاتی ہوئی ایک آسمانی حورِ بلندی کی طرف محورِ پرواز ہوئی اور بحیرہِ روم
 کے اُد پر چھائے ہوئے اُن بادلوں کے تحت پر بیٹھ گئی جو چاند کی کرنوں سے
 سفید بن کر چمک رہے تھے۔ اس کے سامنے سے فضا میں اُڑتی ہوئی روجوں
 کی ایک جماعت گزری جو چیخ چیخ کر پکار رہی تھی! منصر کی مٹی جس کی شہرت
 ... کے گوشے گوشے تک پہنچ چکا ہے۔ ایک ہے۔ ایک ہے۔ ایک ہے۔

خود ہی دیر کے بعد صحن کی کھیتوں سے ایک نوجوان کا خیال اُپر
 کو چڑھا اور حور کے قریب اس تخت پر جا بیٹھا۔ روعوں کی جماعت واپس
 بوٹ آئی اور اس خیال کے سامنے گزرنے ہوئے پکارنے لگی۔ "لبنان جوان
 جس کی شہرت زماتے پھر میں پہیلی پہونی ہے پاک ہے۔ پاک ہے۔ پاک ہے"
 اور جب عاشق نے مختصر تفریق کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کی
 انگلیوں میں آنکھیں ڈال دیں تو اس وقت قصا کی ہواؤں اور سمندر کی
 موجوں نے ان کی سرگوشیوں کو اقطارِ عالم تک پہنچا دیا۔

"ایسیس کی بیٹی بڑی کتنی حسین ہے اور میں کیا بتاؤں مجھے تجھ سے
 کتنی محبت ہے؟"

"عزت کے بیٹے بڑی کتنا خوبصورت جوان ہے اور کیا کہوں میں تجھے
 کتنا پیار کرتی ہوں؟"

"مجھ پر ایسی ہی محبت اور مہربانی کی مانند مضبوط ہے جسے کوئی طاقت
 ٹٹا نہیں سکتی۔"

"میرے محبوب ایسی ہی محبت و احسان کے کھیتوں کی طرح ہے۔ عناصر
 اسے ختم نہیں کر سکتے۔"

”محبوبہ! دنیا بھر کے فلسفی مشرق و مغرب سے تیری حکمت جانتے اور
امرا و معلوم کرنے آتے ہیں۔“

”میرے محبوب! زمین کے بڑے بڑے جابر لوگ دُور دراز ملکوں سے
اسی غرض سے آتے ہیں کہ تیرے جمال کے انسوں سے مسرت اور تیرے
معانی کے جادو میں مدہوش ہو جائیں۔“

”محبوبہ! تیرے ہاتھوں کی ہتھیلیاں نیکیوں کے کھیت ہیں۔“
”میرے محبوب! تیرے بازو میٹھے پانی کے چشمے اور تیری سانسیں سحر
کی مانند ہیں۔“

”محبوبہ! نبیل کے محل اور اس کی عالیشان عمارتیں تیری بزرگی
کی نشانیاں ہیں اور ابوالہول تیری عظمت کی کہانی زبان حال سے سنار رہے
میرے محبوب! تیرے دھان کے کھیت تیری مستحکم شرافت کا پتہ
رہے ہیں اور تیرے ارد گرد مضبوط برج تیرے اقتدار اور تسلط کی بقا کے شاہد ہیں
محبوبہ! تیری محبت کتنی پیاری اور تیرے ساتھ ساتھ اُدھر کو
اُٹھنے والی امیدیں کتنی لطیف ہیں۔“

میرے محبوب! تو کتنا شریف دوست اور کتنا دغا دار ساتھی ہے

میرے تحفے اور تیرے عطیے کتنے حسین اور نفیس ہیں۔ تُو نے وہ نوجوان بھیجے جو نیند کے بعد آنے والی بیداری کی طرح تھے۔ تُو نے کسی شہسوار کا تحفہ دیا تو اس نے میری قوم کی کمزوری کو دُر کیا۔ تُو نے کسی ادیب کا عطیہ بھیجا تو اس نے میری قوم کو بیدار کیا۔“

”محبوب! میں نے بیج کے دانے بھیجے تُو نے ان کو کلیوں کی شکل دے دی۔ میں نے چھوٹے چھوٹے پودے بھیجے تو تُو نے ان کو تناور درخت بنایا تُو ایسا باغ ہے جو گلاب اور چنبیلی کے پھولوں کی پرورش کرتا ہے اور شرار و دھان کے پودوں کو بڑھاتا ہے۔“

”میرے محبوب! تیری آنکھوں میں غم کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ کیا میرے قریب رہتے ہوئے بھی تُو غمگین رہتا ہے؟“

”محبوب! میرے فرزند سمندر پار گئے ہیں اور میرے لئے حرفِ رونا اور شوقِ ملاقات بھیچے چھوڑ گئے ہیں۔“

”میرے محبوب! کاش مجھے بھی تیرے جیسا غم مل جانا اور خوفِ ہراس کا شائبہ میرے دل میں نہ رہتا۔“

”نیل کی بیٹی! تو ساری اقوام پر غالب ہے کیا تُو بھی کسی سے خوف کھاتی ہے؟“

”میں ان شیاطین سے ڈرتی ہوں جو دوست بن کر میرے قریب آ رہے ہیں اور اپنی قوت بازو سے میری باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے رہے ہیں“

”محبوبہ! قومیں کی زندگی بالکل افراد کی زندگی کے مشابہ ہے۔ ایسی زندگی جس کے ساتھ اُمیدیں وابستہ ہیں۔ خوف اس سے ملا ہوا ہے۔ آرزوئیں اس کے گرد منڈلا رہی ہیں اور مایوسی گھور گھبراہٹ سے دیکھتی جاتی ہے۔ اتنی دیر میں باتیں کرنے کے بعد دونوں گلے مل کر ایک دوسرے کے بوسے لینے لگیں۔ رُوحوں کی جھانپیں پھر سامنے سے گزرتی ہوئی گیت گانے لگیں! محبت ہی پاک جذبہ ہے۔ پاک ہے۔ پاک ہے جس کی عظمت آسمان اور زمین پر پھیلی ہوئی ہے۔“

۲۷ دوست کی واپسی

ابھی رات نہیں ہوئی تھی کہ دشمن شکست کھا گیا۔ اُس کی پشت پر مارا اور زینہ سے زخموں کے نشان تھے۔ فتح پانے والا لشکر فخر کے جھنڈے لہاتا ہوا دادی کی چھری زمین پر شور مچاتے ہوئے گھوڑوں کے سموں کی آواز کے ساتھ فتح و نصرت کے گیت گاتا ہوا واپس لوٹا۔

دُور افق سے چاند نکل رہا تھا اور یہ لشکر ایک سیلے پر چڑھا۔ وہ ٹیلہ ایسے دکھائی دینے لگا جیسے وہ قوم کی اُٹھتی ہوئی آوازوں کے ساتھ آسمان پر چڑھنے لگا ہو۔ ان ٹیلوں کے درمیان دھان کے کھیت اس طرح نظر آنے لگے گویا وہ بھان کے سینے پر گزری ہوئی نسلوں کی ثبت کی ہوئی شرافت

کی نہیں ہیں۔

چاند کی کرنیں لشکر کے چمکتے ہوئے اسلحہ پر پڑ رہی تھیں۔ دُور دُور کے پہاڑ اس کے نعروں کا جواب دے رہے تھے اور وہ پچھلے جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ پہاڑ کی چوٹیوں پر پہنچا تو رتیلی گھاٹیوں سے گھوڑے کے منہانے کی آواز نے اس کو وہیں ٹھیرا لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ گھوڑا اس کو خوش آمدید کہہ رہا ہے حقیقت حال معلوم کرنے کے لئے لشکر گھوڑے کے قریب آیا۔ لشکر والوں نے دیکھا کہ مٹی اور خون میں لت پت اکیلاش پڑی ہوئی ہے، فوج کا سپہ سالار چلا آیا! مجھے اس کی تلوار دکھاؤ تاکہ میں پہچان سکوں کہ یہ کون ہے؟ فوج کے بعض سوار گھوڑے سے اترے اور لاش کے ارد گرد کھڑے ہو کر اسے ٹوٹنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک سوار سردار کے پاس آکر بھڑائی ہوئی آوازیں کرنے لگا: اُس کی ٹھنڈی انگلیاں تلوار کے دستے کے گرد جمی ہوئی ہیں۔ ان انگلیوں سے تلوار چھین لینا بہت مشکل ہے۔“

جوسے نے کہا: اُس کی تلوار کی آبِ نون کے نیام میں چُپی ہوئی ہے“
تیسرے نے کہا: پتھیلی اور تلوار کے دست پر خون جم گیا ہے۔ کھلاتی

کے ساتھ مضبوط جما ہوا ہے اور دونوں ایک ہو گئے ہیں۔

سردار گھوڑے سے اترا اور یہ کہتا ہوا مقتول کے قریب گیا! اس کا سراٹھا لوتا کہ چاند کی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھ سکیں۔ انہوں نے جلدی سے اس کا سراٹھایا۔ موت کے پردے کے نیچے سے مقتول کا چہرہ ظاہر ہوا شجاعت اور بہادری کے آثار اب تک اس میں صاف نظر آرہے تھے۔ ایک ایسے شہسوار کا چہرہ جو زبانِ حال سے اپنی بہادری کی داستانیں سُنا رہا تھا، مسرت اور انسوس کے نشان ایک ہی ساتھ اس پر نظر آرہے تھے ایسا چہرہ جو دشمن سے غضب کی حالت میں اور موت سے مسکراتا ہوا ملا، ایک لبنانی بہادر کا چہرہ جو آج کی لڑائی میں شریک رہا اور جس نے فتح کی علامات اپنی آنکھوں سے دیکھیں لیکن موت نے اسے اتنی بھی مہلت نہ دی کہ وہ اپنے ساتھیوں سے مل کر فتح کی خوشیاں منانا جب انہوں نے اس کا نعاب اُتارا اور اس کے زرد چہرے سے گرد و غبار دُور کیا تو سردار گھبراہٹ اور تکلیف سے چیختے ہوئے بولا! آہ! یہ تو ابنِ الصبیعی ہے۔ لشکر کے تمام سپاہی بھی یہ سن کر آہ دہکا کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد یہ سب خاموش ہو گئے اور سکوت طاری ہو گیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فتح و ظفر کی شراب

کاخمار ان بدمست سپاہیوں کے سر سے اتر گیا اور ان کو اب اس بات
 کی ہوش آئی ہے کہ لڑائی میں حاصل کی ہوئی تمام کامیابی اس ایک
 بہادر کی جان کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اس حقیقت کو سمجھ
 لینے کے بعد ان کی زبانوں پر مہر سکوت لگ گئی اور وہ پتھر کے بُت بنے کھڑے
 کے کھڑے رہ گئے۔ — بہادر اور شیر دل مردوں کے قلوب موت کا
 یہی اثر لیتے ہیں۔ موت کا نظارہ دیکھ کر رونا اور پٹینا عورتوں کا اور بچپنا چلاتا
 بچوں کا کام ہے۔ شمشیر بکف مجاہدوں کے چہروں پر موت کو دیکھ کر سیت ڈھکا
 اور ایسی خاموشی طاری ہو جایا کرتی ہے جیسے کوئی باز اپنے شکار کی گردن
 دبونچ لے۔ — ایسی خاموشی آنکھ کے آنسوؤں کو خشک اور زبان سے
 نکلنے والی زہر یاد کو بند کر دیتی ہے اور اسی وجہ سے یہ مصیبت اور زیادہ ہولناک
 اور دردناک صورت اختیار کر لیتی ہے۔ — ایسی خاموشی فضا میں اڑتی
 والے نفوس کو ہوا کی چوٹیوں سے گہرے گڑھوں میں دھکیل دیا کرتی ہے
 — اور ایسی خاموشی اکثر آنے والے طوفانوں کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے۔
 بہادر مقتول کے کپڑے اتار کر دیکھنے لگے کہ کونسا مقام موت کا نشانہ
 بنا ہے۔ نوکدار نیزوں کے زخم نوجوان کے سینہ پر یوں نظر آنے لگے گویا

وہ رات کی پُرسکون خاموشی میں جوان مہمت نوجوان کی بہادری اور شجاعت کا پیغام دنیا کو دے رہے ہیں۔ لشکر کا سردار لاش کو غور سے دیکھنے کیلئے اور قریب آیا۔ اس کی نظر نوجوان کی کلائی سے بندھے ہوئے زرکشی رُمال پر پڑی۔ اس نے اسے غور سے دیکھا اور رُمال بنانے والے ہاتھ کو پہچان گیا وہ جلدی سے رُمال کو اپنے کپڑوں اور اپنے غمگین چہرے کو بڑھاتے ہاتھوں سے چھپاتا ہوا قدم پیچھے ہٹا۔ غمگین چہرے کو چھپانے والے ہاتھ وہی ہاتھ تھے جو اپنی ایک حرکت سے بڑے بڑے بہادروں کے سر اُتار دیا کرتے تھے لیکن اب وہ کمزور پڑ گئے تھے ان پر لڑہ طاری تھا اور وہ آنسوؤں کو پونچھ رہے تھے۔ یہ کیوں؟ صرف اس لئے کہ ان ہاتھوں میں وہ رُمال تھا جو مقتول نوجوان کی کلائی پر ایک حسین اور نازک محبوبہ نے باندھا تھا۔ وہ نوجوان جو یہ ارادہ لے کر آیا تھا کہ اپنی بہادری کے جوہر دکھا کر اپنی اور قوم کی عزت کی حفاظت کر لیا اور جواب اپنے ساتھیوں کے کندھوں پر سوار ہو کر مجبور کے سامنے جائیگا۔

سردار کے خیالات موت کے مظالم اور محبت کے اسرار کے مندرجہ میں غوطے کھا رہے تھے کہ ایک نے کہا: آؤ! بلوط کے اس درخت کے

نیچے اس کی قبر کھودیں۔ اس کی جڑیں اس کے خون سے سیراب ہو گئی اور
 ہکا جسم اس کی شاخوں کی غذا بنے گا۔ اس طرح درخت کی جڑیں مضبوط
 اور اس کی عمر پائیدار بن جائیگی یہ درخت ہمیشہ کیلئے ان ٹیلوں کے سامنے
 نوجوان کی بہادری اور شجاعت کی یادگار رہیگا۔

دوسرے نے کہا: "اس کو چادلوں کے کھیتوں میں گرجے کے قریب دفن
 کرنا چاہئے تاکہ اس کی ہڈیوں پر ہمیشہ کے لئے پاک صلیب کا مبارک سایہ پڑتا
 رہے۔"

تیسرے نے کہا: "اس کو اسی مقام پر دفن کرنا چاہئے جہاں کی مٹی
 اس کے خون سے سیراب ہو چکی ہے۔ اس کی تلوار اس کے دائیں طرف
 رکھ دینی چاہئے اس کا نیزہ اس کے بائیں طرف گاڑھ کر اس کے گھوڑے
 کو اس کی قبر پر ہی ذبح کر دینا چاہئے تاکہ اس کی تنہائی میں اس کا اسلحہ
 اس کا دائمی مونس و غمگسار ہو۔"

چوتھے نے کہا: "دشمن کے خون سے رنگین تلوار کو مٹی میں دفن نہ کرو
 موت کے میدان میں آگے بڑھتے ہوئے گھوڑے کو ذبح نہ کرو اور ان
 ہتھیاروں کو خالی میدان کے سپرد نہ کرو جو مضبوط کلائیوں اور طاقتور ہاتھوں

میں رہنے کے عادی ہیں بلکہ ان تمام اشیاء کو نوجوان کے صحیح وارثوں تک پہنچاؤ۔ اس لئے کہ وہی اس کے سچے حقدار ہیں۔“

پانچویں نے کہا: ”آؤ! ہم سب مل کر اپنے مذہب کے مطابق اس کی لاش پر نماز پڑھیں اور اس کے لئے دعا مانگیں تاکہ اس کی بخشش ہو اور ہماری فتح اس بہادر کی وجہ سے مبارک رہے۔“

چھٹے نے کہا: ”آؤ! نیزوں اور ڈھالوں کا تابوت بنا کر اس کو اپنے کندھوں پر اٹھائیں۔ فتح و ظفر کے گیت گاتے ہوئے ان دادیوں کے چکر کاٹیں تاکہ نوجوان اپنے ضمیر کی آنکھوں سے دشمن کی لاشوں کو دیکھے اور مٹی میں مل جانے سے قبل اس کے زخم دشمنوں کو دیکھ دیکھ کر ہنسیں۔“

ساتویں نے کہا: ”نہیں۔ آؤ۔ اس کو اپنے گھوڑے کی زین پر بٹاکر دشمنوں کی کھوپڑیوں کا سہارا اس کے لئے تلاش کریں۔ اس کے نیزے کو اس کے گلے میں لٹکائیں اور کامیاب مجاہد کی طرح اسے شہر میں لے جائیں اس لئے کہ اس نے اس وقت تک جان نہیں دی جب تک دشمنوں کی روحوں کا بھاری بیجھ اس کے کندھوں پر نہ پڑا۔“

آٹھویں نے کہا: ”آؤ! اس پہاڑ کے دامن میں اس کے جسم کو میٹر خاک

کر دیں ہم بشارتوں کی صدائیں اس کا ساتھ دینگے۔ ندیوں کی آوازیں امر کی غمگسار نہیں گی اور اس طرح ایسے جنگل میں جہاں رات بھی دبلے پاؤں آیا کرتی ہے اس کی ہڈیاں ہمیشہ مسرت محسوس کرینگیں۔

نواب نے کہا اُس کو میاں دھچھوڑو۔ اس جنگل میں وحشت برستی ہے اور منسوب تنہائی اس جگہ طاری رہتی ہے بلکہ چلے اس کے قبرستان میں بے جائیں۔ ہمارے ابا و اجداد کی روعیں اس کے ساتھ رہیں گی۔ رات کی خاموشی میں آپس میں سرگوشیاں کرینگیں اور اپنی لڑائیوں اور اپنے کارناموں کے قصے اس کو سنائیں گی۔“

یہ تمام تجویزیں سننے کے بعد سردار لشکر کے درمیان آیا۔ سب کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش کیا اور پھر ٹھنڈی آدھ بھرتے ہوئے کہا :
 لڑائیوں کی یاد دلا کر اس کے سکون میں خلل نہ ڈالو۔ اس کی رُوح کے کانوں تک جو ہمارے سردوں پر اڑ رہی ہے تلواروں اور نیزوں کی خبریں نہ پہنچاؤ بلکہ آداس کو آرام سے اٹھا کر اس کے گھر پہنچائیں۔ اس لئے کہ اس قبیلہ میں ایک ایسی رُوح ہے جو اس کے استقبال کے لئے ہمیشہ سے جاگ رہی ہے۔ ایک نوجوان دوشیزہ کی رُوح جو نیزوں سے گھرے ہوئے میدان

سے اس کی واپسی کی منتظر ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اس کی لاش کو اس تک پہنچا دیں تاکہ وہ اس کے چہرے پر آخری نظر ڈالنے اور اس کی پیشانی کا آخری بوسہ لینے سے محروم نہ رہے۔

نوجوان کی لاش کو کندھوں پر اٹھایا گیا۔ سب کے سر جھکے ہوئے اور آنکھیں اشک آلود تھیں۔ غم انگیز خاموشی کے ساتھ وہ جا رہے تھے اور نوجوان کا گھبراہٹ انگین صورت بنائے اپنی لگام کو پیچھے کھینچ کر پیچھے آ رہا تھا۔ وہ کبھی کبھی ہنسنے لگتا۔ ٹیلے اس آواز کا جواب صدائے بازگشت کی شکل میں دیتے۔ گویا کہ وہ ٹیلے بھی ایسے دلوں کے مالک ہیں جو اس فاشعار جانور کے درد و کرب کا احساس رکھتے ہیں۔

اس وادی کے درمیان جہاں چاند کی چاندی چوری چوری قدم رکھتی ہے، فتح و ظفر کا قافلہ موت کے تافلے کے پیچھے پیچھے اور ددون ٹانگوں کے آگے آگے خیالی محبت اپنے ٹوٹے ہوئے پردوں کو گھسیٹتے ہوئے جا رہے تھے۔

سُورج مند

اے عالمِ ارجح کی فضا میں گھومنے والی رُوح ! اے
دُہ کہ تُو نے اس مادی لباس کو پھینک دیا ہے جو ہم اس وقت پہن
رہے ہیں۔ تُو نے ضعف و مایوسی سے پیدا شدہ کلام کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا
اسی کلام کو جس نے جسم کے قیدی انسانوں کے قلوب میں کمزوری اور مایوسی
کا احساس پیدا کر دیا تھا۔

تو اس دقت جانتی ہے کہ اس زندگی میں ایسے معافی پرشیدہ ہیں جن
کو موت نہیں چھپا سکتی لیکن انسان ان حقائق کو نہیں جان سکتا کیونکہ

صرف اس وقت پہچانی جاتی ہیں جب نفس جسم کی قیود سے آزاد ہو جائے
 تو اس وقت جانتی ہے کہ زندگی ہوا کی طرح ناپائیدار نہیں ہے اور
 تو یہ بھی جانتی ہے کہ اس سُورج کے نیچے کوئی چیز بھی بیکار نہیں بلکہ ہر چیز
 ہمیشہ سے حقیقت کی طرف بڑھتی چلی آئی ہے اور بڑھتی چلی جائیگی لیکن
 ہم بے چاروں نے تیرے کلام کا سہارا لیا۔ تیری باتوں کو سوچتے رہے اور
 انہیں کو حکمت کا مجموعہ سمجھا حالانکہ ————— تو جانتی ہے ————— وہ ایسی
 ظلمت ہے جو عقل کو بیکار بنا دیتی ہے اور امتیاز کی کرنوں کو چھپا دیتی ہے۔

تو اب جانتی ہے کہ حماقت، شرارت اور ظلم کے اسباب جمالیاتی بھی
 ہوئے ہیں لیکن ہم جمال کو صرف ظاہری حکمت، مہترا انجام اور عدل کے پھل
 ہی سے پرکھنے کے عادی ہیں۔

تو جانتی ہے کہ غم اور غریبی انسانی دل کو صاف کر دیا کرتے ہیں لیکن
 ہماری ناسمجھ عقل صرف خوشی اور دولتندی ہی کو زندگی کا سہارا سمجھتی ہے۔
 تو اب جانتی ہے کہ نفس زندگی کے مصائب سے تنگ آکر ابدی نور
 کی طرف بڑھتا جاتا ہے لیکن ہمارے ذہن میں ہر وقت تیری یہی بات چکر
 کاٹتی رہی کہ انسان کسی غیر معروف قوت کے ہاتھ میں ایک کھلونہ ہے۔

تو ایسی روح کو باقی رکھنے سے نا دم ہو رہی ہے جو حیاتِ حاضرہ
 کی محبت کو ترقی دے رہی ہے اور آنے والی دائمی زندگی کو ختم کر دینے
 پر تلی ہوئی ہے۔ لیکن ہم اب تک تیرے اقوال ہی کو یاد رکھتے ہیں۔
 اے غیر فانی دنیا میں بسنے والی روح! حکمت کے عاشقوں کے
 دل میں یہ بات ڈال دے کہ وہ نا اُمیدی اور انکار کے راستوں کو چھوڑ دیں
 یہی تیری غیر ارادی غلطی کا کفارہ ہو سکتا ہے۔

درخت کی کہانی اُسکی اپنی زبانی

میری کہانی بہت طویل ہے میری ابتداء اُس وقت ہوئی جب میں گٹھلی کی شکل میں زمین کے نیچے دبا ہوا تھا اور گٹھلی کا مغز جھپکے کو بھڑا کر سر نکالنے کی کوشش کر رہا تھا میں خود اپنے وجود کو باہر نکال کر روشنی دیکھنے کی منتا میں تھا۔

اس صبح کی یاد میں مجھے اب تک لطف آتا ہے جب میں نے پہلی بار اپنے آپ کو زمین کے ایک شکاف سے سر نکالتے ہوئے اور ان جنگلوں اور کھیتوں کی ہوا اُکھانے ہوئے دیکھا۔ کتنی خوشگوار گھڑی تھی۔

کہ بیشمار بہاریں گزرنے کے بعد بھی اس کی یاد میرے دل میں باقی ہے
 باوجود اس کے کہ اس وقت میں زمین سے پیوست تھا۔ میری کمزور
 شاخیں دُور سے ایک ہی شاخ کی شکل میں نظر آرہی تھیں۔ اس وقت
 بھی میرے دل میں ایک اُننگ تھی جو ہر درخت میں فطری طور پر باقی
 جاتی ہے۔ لیکن اس کو بیان کرنا ہماری طاقت سے باہر ہے۔ چاہے
 ہماری شاخیں اور پتے ہونٹوں اور زبانوں میں تبدیل کیوں نہ ہو
 جائیں۔۔۔ اپنے دل میں بسنے والی بات کے بیان کرنے سے بھی
 ہم عاجز ہیں۔۔۔ ہماری سرسبز زندگی میں نہیں بلکہ ہر اُس چیز
 کی زندگی میں جو زمین سے نمودار ہوتی ہے یا زمین کی سطح پر چلتی
 پھرتی ہے، وہ اسرار پوشیدہ ہیں جو ظاہری علامات سے پہچانے
 نہیں جاسکتے۔

میری عمر کی پہلی بہار گزر چکی۔ گرمی آئی وہ بھی گزر گئی۔ پھر
 خزاں آئی۔ اب میری قامت بڑھ چکی تھی میرا سر اُوپر کو اٹھ گیا
 تھا اور میں نے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ دُور دُور جنگل کا وسیع میدان
 اور کہیں کہیں اس کے موڑ نظر آنے لگے۔ میں نے صبح کے وقت شاخوں

کے سایلوں کو دیکھ کر سوچنا شروع کر دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان سایلوں کی شکلیں بھی بدلتی تھیں، شام ہونے کے ساتھ ساتھ وہ شکلیں مٹ جاتیں اور ان کا نام و نشان باقی درہنہ ان سایلوں میں ایک جادو بھرا رہے جو ہمیں جستجو کی دعوت اور ترغیب دیتا ہے۔ میں نے اپنے دل سے کئی بار پوچھا کہ درختوں کے اسرار تو ان کے سایلوں کی حقیقت سے بھی زیادہ غامض ہونگے..... کئی بار تو مجھے یہ خیال آتا ہے کہ اس جھل میں جو کچھ دیکھتا ہوں اور جو آواز بھی میرے کانوں میں پڑتی ہے وہ کسی ایسی چیز کا سایہ ہے جسے ہم دیکھتے نہیں — وہ کسی ایسی مخلوق کی مدائے بازگشت ہے جو آنکھوں سے پوشیدہ ہے۔

ان گزشتہ تین مہینوں میں میں نے اپنی زندگی کا جائزہ لیا۔ مجھے یہ زندگی ایک مسلسل خوشگوار عبادت کی طرح معلوم ہوتی جو میری کمزور ہڈیوں کے لرزے سے لرز رہی ہو۔ میرے باریک پتوں کی دھمک کو ساتھ لے کر آسمان کی طرف چڑھتی ہے لیکن اس زمانہ میں سب سے بہترین راز جو مجھے معلوم ہوا وہ یہ تھا کہ میری نازک شاخیں اس چڑیا کے بوجھ سے بھی جھک جاتی تھیں جو کسی اُدبچے درخت سے کوڑ کر

ان پر آبلجھتی بھتی میں نے جب بھی اس چڑیا کا تصور کیا تو اپنے اندر خوشگوار احساسات کا لطیف جذبہ محسوس کیا ہے۔ اس لئے کہ وہی سب سے پہلا پرندہ تھا جس نے مجھے قابلِ توجہ سمجھا اور مجھے اپنی ملاقات کا شرف بخشا۔ اور عجیب بات تو یہ ہے کہ میں نے جب بھی اس پرندے کو یاد کیا اپنے اندر جھک جانے کا احساس پایا۔ حالانکہ میری عمر اب اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ میرا تنا مضبوط اور میری شاخیں سخت ہو چکی ہیں اور مضبوط چٹانوں سے ٹکراتی ہوتی ہوا میں مجھ سے ٹکراتی ہوئی گذر جاتی ہیں۔

خزاں کا وہ موسم بھی گذر چکا۔ سردی کا موسم آیا۔ جاڑے کی سرد ہواؤں نے میرے زرد پتے جھاڑ دیتے اور پھر میرے ساتھ کھیلنے لگیں کبھی وہ مجھے گھاس کی طرف جھکا دینیں جیسے کہ وہ مجھ سے کوئی انتقام لے رہی ہوں اور کبھی میرے دل کے تاروں کو چھیڑ کر اور بیتے ہوئے دن پاؤں دلا کر مجھے ناچنے پر مجبور کرتیں اور اس طرح غرض آسودا قات کی اُمید دلاتیں۔ محتوڑے دنوں کے بعد بر فباری شروع ہوئی اور میں چنبیلی کے پھول کی طرح سفید لباس میں ملبوس نظر آیا۔ سردی سے میں

کانپ تو اٹھا لیکن اس کے باوجود اس لباس سے مجھے کچھ انس سا
ہو گیا خصوصاً اس وقت تو میں پھولے نہ سماتا اور فخر و غور سے بار بار
اپنے آپ کو دیکھتا رہتا پھر جب بادل چھٹ جاتا اور سورج کی شعاعوں
سے میرا یہ برفانی لباس اور زیادہ چمکنے لگتا۔

سردی کے وہ آیا م بھی گزر چکے۔ میں تیز و تند آندھریوں اور لگاتار
برفباری کا مقابلہ کرتا رہا۔ یہ پورا دما نہ ایسے گزر گیا جیسے کوئی شخص ایک
طویل عرصہ سے سو رہا ہو اور کبھی کبھی اس کی آنکھ کھلتی رہے۔

نہ تو خوفناک سردی مجھ میں کمزوری کے آثار پیدا کر سکی اور نہ اسکی
سختی میری دلی اُمنگیں کو دبا سکی۔ جب بھی تیز ہوا میں چلنی شروع
ہوتی میں اپنی جڑوں کو اور سختی سے زمین کے اندر پیوست کر دیتا اور
مٹی کے نیچے دبئی ہوئی کنگریوں پر اپنے پنجے مضبوطی سے گھاڑ لیتا۔

بہت دفعہ مجھے خیال آیا کہ یہ تیز و تند ہوا میں بھی شفیق استاد بن کر کمزور
اور نو عمر درختوں کو سکھانے پڑھانے آتی ہیں کہ زمین پر مضبوطی سے
پنچے گاڑ دھنے کا طریقہ کیا ہے۔ وہ اپنے آپکے ایک غضبناک دشمن کے
عصیان میں ظاہر کرتی ہیں جو اپنے حملوں سے ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ

پھینکنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

میں آندھیوں کا بھی ممنون ہوں۔ اگر یہ آندھیاں نہ ہوتیں تو مجھے ہرگز اس بات کا پتہ نہ چلتا کہ جن کی جڑیں کھوکھلی ہوتی ہیں ان کی شاخیں کبھی سر بلند نہیں ہو سکتیں اور جو تارکیوں میں گھس جانے سے گریز کرتا ہے وہ کبھی نور کو پا نہیں سکتا۔

بہار کا دوسرا موسم آیا تو میری رگ رگ میں زندگی کا خون دوڑنے لگا۔ میری شاخوں نے سبز چھوٹے پتوں کا لباس پہن لیا۔ میں نے سوچا کہ بس اب میں انتہائی عروج تک پہنچ گیا۔ اُس وقت میرے ذہن میں اس کا خیال تک نہیں تھا کہ ہر سعادت کے بعد ایک اور سعادت آتی ہے جو پہلے سے کہیں زیادہ ہوتی ہے اور ہر کمال کے بعد ایک اور بام عروج ہوا کرتا ہے۔

بہار کے تیسرے موسم میں پہلی کلی میرے جسم کے ایک حصے پر نمودار ہو گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا جسم اچانک ایسے پھولوں میں تبدیل ہو گیا ہے جہاں آسمان اور زمین کو دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ ہوا کے کانوں میں ایسے مہکتے والے کلمات پھونکتے ہیں جن میں وہ محبت بھرے دلوں کی سرگوشی عابدوں کی

ذاری اور شاعر دل کا تخیل رقص کرتے ہیں۔

مختوڑے دنوں میں نسیم سحری کے جھونکوں سے میرے جسم پر کھلتے
ہوئے پھولوں کی تعداد بڑھنے لگی میری شاخیں پھولوں سے لدنے
لگیں اور میں ہر پھول کے کھل جانے پر یہ سمجھتا کہ میری رُوح کا ایک جزُ مجھ
سے چھین لیا گیا۔ اس احساس کی وجہ سے میں قدرت کی ان شہنشاہوں سے
دل برداشتہ ہو گیا۔ میں دل میں کہتا کہ آخر یہ کونسا طریقہ ہے کہ قدرت اپنے
ہی ہاتھوں میں ایک حسین لباس پہناتی ہے اور پھر جلد ہی اُسے اُتر دیتی ہے۔

ان دردناک احساسات کے ساتھ مختوڑے ہی دن گزرے تھے
میں نے دیکھا کہ ہر جھڑے ہوئے پھول کی جگہ میرے جسم پر ایک تازک ،
خوش دُخ اور خوش رنگ پھل ظاہر ہو گا۔ یہ دیکھ کر خوشی کی وجہ سے میری
حالت اُس انسان جیسی ہو گئی جو ڈرانا اور خوفناک خواب دیکھنے دیکھتے
گھبرا کر اُٹھتا ہے تو صبح کی ٹھنڈی ہوا اس کے استقبال کے لئے موجو
ہوتی ہے۔ مجھے یقین آیا کہ نقصان کے بغیر نفع اور سخاوت کے بغیر بخشش
کی اُبتد بے سود ہے۔

ایک ہفتہ کے اندر اندر اس نازک پھل کے مغز کے ارد گرد سخت
چھلکے کا غلاف چڑھ گیا اور مجھے محسوس ہوا کہ میں اب "ماں" بن گیا ہوں۔

ہزاروں بچوں کی ماں اور میں نے دیکھا کہ قدرت کے مخفی ہاتھوں نے
اس ایک گٹھلی کو ہزاروں گٹھلیوں میں بدل دیا ہے جسے انہیں ہاتھوں نے
آج سے تین برس پہلے مٹی کے نیچے دبایا تھا اور ان میں سے ہر گٹھلی اس
کی اہل ہے کہ وہ کسی نہ کسی دن اُدبچے تناور درخت کی شکل اختیار کرے
اور اسی طرح یہ موت و حیات کا سلسلہ چلتا رہے۔ کیسی معرفت ہے
جس نے مستقبل کے حالات میرے سامنے رکھے اور مجھے یقین دلایا
کہ میرے پھل ہمیشہ باقی رہیں گے۔ کیسی نشوونما ہے جس نے مجھے
زندگی کے اسرار اور اس کے کھلے ہوئے حقائق کے سامنے لا کھڑا کیا۔

مہینوں پر موسم اور سالوں پر سال گزرتے گئے اور میں اسی طرح
پھلتا، پھولتا اور اُدب کو اُدبنا ہوتا گیا۔ میرا چھلکا سخت ہو گیا۔ میری
ٹہنیاں ہر طرف پھوٹنے لگیں اور میری شاخیں ایک دوسرے سے الجھنے
لگیں۔ میں ایک ایسے سرسبز اور مضبوط درخت کی شکل میں تبدیل ہو گیا جو
اپنے مناقب پر فخر کرتا ہو اور اپنے محاسن کو سراہتا ہو۔ لڑکے میرے اُدب

چڑھ کر کھینے لگے۔ پرندہاں نے میرے پتوں کے اندر اپنے گھونسلے بنائے۔
جانور میرے سائے میں سستانے لگے اور سورج کے نیچے ایسی کمی پھینچ
باقی درہی جن کو میں نے آزمایا نہ ہو۔ میں نے ایسی بے شمار راتیں
کھڑے کھڑے گزار دیں جن میں نسیم کے ٹھنڈے جھونکے چلتے رہے۔
میں ٹیلیوں اور گھائیٹوں کو تاکتا رہا۔ بندلیوں کی ترقم زاداؤں کو کان
لگا کر سُنتا رہا۔ میں نے ستاروں پر نظریں جمائیں اور تاریکی کے سیالوں
کی حرکتیں محسوس کرتا رہا۔

بہت سے پرندے میرے پتوں میں چھپ کر دردناک آواز سے
پکارتے رہے۔ ان کی دردناک آوازیں میرے دل میں ایک نامعلوم
خلش پیدا کرنے کا سبب بنیں اور میں چاہتا کہ کاش ایسی تیز آندھی
چلے جو مجھے جڑ سے اکھاڑ کر دُور کسی اور جنگل میں ڈال دے۔

بہت سے کیڑوں نے میری جڑوں کو کھوکھلا کیا، پرندوں نے
میرے پھل توڑے۔ مجھے دن کی روشنی میں آرام ملتا اور رات کی
تاریکی میں، اور میری حالت ایسی عورت کی طرح تھی جو کسی مرد سے محبت
کرے اور وہ اس سے دُور رہے اور اس کی جگہ الیسا مرد اس کے سر پر

مسلط ہو جس سے وہ نفرت کرتی ہو۔

ہاں۔ میں نے زندگی کی مسرت اور اس کے مصائب دونوں کو آزمایا ہے۔ میں نے اس کی محبت اور نفرت دونوں کا تجربہ کیا ہے میری حالت چار موسموں میں اس ترازو کی تھی جس کے پلٹے بادی ماری اُدپر کو اُٹھتے اور زمین کو چھوتے ہیں۔

میں نے اپنی زندگی کے ان سات ^{سال} سلطوں میں جو میں نے سوچ کے سامنے کھڑے ہو کر گزارے انسان کے ایسے ایسے مصائب و مظالم کا مشاہدہ کیا جن کی یاد کو میرے دل سے نہ تو بہار کی خوش آفرینی مٹا سکتی ہے اور نہ سردی کی مدہوشی اس کو فراموش کرا سکتی ہے۔ وہ ایسے حادثے بھی مجھ پر گذرے کہ جب میں ان کو یاد کرتا ہوں تو میری رُوح کانپ اُٹھتی ہے اور مجھے اپنے گرد مظلوم رُوحوں کی ایک بھٹی نظر آتی ہے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک دن پتی ہوئی گرمی کے موسم میں جب پرندے اپنے اپنے گھونسلوں کو واپس لوٹ چکے تھے اور کلیوں کی پتیاں ایک دوسرے سے چپٹی ہوئی تھیں۔ سامنے ٹیلے کے پیچھے سے

ایک نوجوان میری طرف آیا۔ میرے تنے سے سہارا لے کر ٹنگی آن لکھوں
 سے راستہ کی طرف دیکھنے لگا۔ نوجوان کی عمر بیس سال کے لگ بھگ
 تھی۔ بھٹوڑی دیر میں ایک نوجوان دوشیزہ غم و اندوہ کا نقاب منہ پر
 ڈالے نمودار ہوئی۔ وہ نوجوان کے قریب آئی۔ اس کے سینے پر اپنا سر
 رکھا اور مچھوٹ مچھوٹ کر رونے لگی۔ نوجوان نے اسے اپنے سینے سے
 بچھین لیا اور دھیمی آواز میں کہنے لگا! ”جنابِ من! دل کو ڈھارس دو
 جدائی کی گھڑیاں زباں لمبی نہیں ہوئیں۔ میں سال و دو سال کے اندر اندر
 واپس آ کر تم سے ملونگا اور اس وقت دونوں مل کر اپنی آئندہ زندگی
 خوشی سے گزار دیں گے۔“ دوشیزہ نے جواب دیا۔ ”کون جانے! جہاں
 تم جا رہے ہو وہاں کسی اور سے مل کر میری یاد اپنے دل سے نکال دو۔“
 ادھر میں اس وقت تک اپنے وعدے پر قائم ہوں جب تک تمہاری
 ماں مجھے شبِ عروسی کے کپڑے یا اپنی ماں مجھے کشن نہ پہنا دے۔“
 اتنا کہتے ہی اُس کی آواز بھرا گئی اور وہ رگ رگ کر کہنے لگی۔ ”مندر ہم سے
 جو چیز چھین لیتے ہیں وہ کبھی واپس نہیں دیتے۔ خدا ان سمندروں کا
 ستیا ناس کرے اور ساتھ ہی ان لوگوں کا جنہوں نے سمندروں میں

سفر کا دستور پہلے پہل شروع کیا۔ اتنا کہ کر وہ زار و قطار رونے لگی
نوجوان نے اسے گلے لگایا۔ اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور مچھرائی کھوس
کو بوسہ دیتے ہوئے ایمان کی قسم کھا کر کہنے لگا کہ سال ختم ہونے سے
پہلے پہلے وہ اس سے آکر ملے گا پھر وہ دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ
ہوئے اور میرے گرو اپنے درد و غم کا کمر چھوڑ کر چلے گئے۔

دوسرے دن شام کے وقت دوشیزہ تنہا آکر وہیں بیٹھ گئی جہاں
پچھلی رات وہ اپنے محبوب کے ساتھ کھڑی بانیں کر رہی تھی۔ اس نے
ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف دیکھنا شروع کیا معلوم ہوتا تھا کہ بڑا افق
کے سیاہ خط اور سنہرے بالوں کے درمیان ایسی ابدی حقیقت کی جستجو
کر رہی ہے جو روشنی اور اندھیرے، زندگی اور موت کی شکل میں نمودار ہو
پھر اُس نے زمین پر نظر ڈالی اور قریب ہی اسے اپنے محبوب کا نقش
قدم نظر آیا۔ وہ لرزتی ہوئی انگلیوں سے قدم کے نشانات کو چھونے لگی
پھر زار و قطار رونے لگی۔

اسی طرح وہ دوشیزہ میرے پاس آتی رہی اور میرے سائے میں
بیٹھتی رہی۔ کبھی کبھی وہ دردناک اور دھیمی آواز سے غم کے گیت گاتی اور اس

کی آواز کے ساتھ ساتھ جنگل کی تمام مستریں غم و اندوہ میں بدل جاتیں۔
 اپنی عادت کے مطابق وہ اس دن بھی آئی جب ان کی جدائی
 کے پورے دو برس گزر چکے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ہر شدہ خط تھا جس
 کو وہ بار بار چومتی تھی۔ اس نے نفاق چاک کیا اور ابھی اس خط کی
 چند سطریں ہی پڑھ سکی تھی کہ وہ تڑپتی ہوئی زمین پر گر پڑی اس کی
 انگلیاں زمین میں دھنس گئیں اور پھر وہ یکبارگی سیدھی اٹھ کھڑی ہوئی
 اور زلفیں کبیر کے اونچی آواز سے منہ ہتی ہوئی درختوں سے کھیلنے لگی۔
 نہیں! میں نے اپنی زندگی میں ایسی شے کبھی نہیں سنی تھی! اندھیل
 کا شور میں نے سنا تھا۔ بجلی کی کڑک کی آوازیں میرے کانوں میں پڑی
 تھیں۔ جھوٹے درندوں کی چنگھاڑیں میرے کانوں تک پہنچی تھیں لیکن
 دوشیزہ کی عجیب اور بہت ناک شہسی کی آواز کبھی میرے کان میں نہیں آئی
 میں نے ایسی آواز کبھی نہیں سنی جس میں خوف، غم، مایوسی اور جنون
 کے جذبات بیک وقت موجود ہوں۔ اس دوشیزہ کی شہسی سے پہلے میرے
 تصور میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ موت کی خوفناک آواز شہسی کی صورت میں
 سنا جاتا ہے۔

یہ پہلا عظیم حادثہ تھا۔

دوسرا حادثہ اس سے بھی دردناک ہے۔ اس کی یاد، جب بھی میرے دل میں آتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی میری جڑوں میں شاخوں اور ٹہنیوں کو تیز درانتی سے کاٹنے لگا ہے اور اب جبکہ میں اس واقعہ کا ذکر کرنے لگا ہوں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر میری آواز کے ساتھ ساتھ دیر در دیر ہورہا ہے لیکن الفاظ کے ساتھ ساتھ باہر نہیں نکلتا۔

سات سال ہوئے فوج کی ایک جماعت، زنجیروں میں جکڑے ہوئے ایک نو جوان کو ان ٹیلیوں پر لٹائی۔ نو جوان کی شکل و ثیاب بہت اور اس کے اعضاء و اطوار اس کی شرافت اور شجاعت کا پتہ دے رہے تھے۔ جب وہ جماعت اس ٹیلے کے قریب پہنچی تو فوج کے سردار نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”یہ درخت بہت موزوں ہے۔“ وہ سب میرے قریب آئے۔ ایک آدمی اس نو جوان کو لے کر آگے بڑھا۔ اور اس کی گردن میں رسی کا پھندا ڈالا۔ پھر انہوں نے میری ایک شلخ پر رسی لٹکائی اور چند آدمیوں نے مل کر رسی کھینچنی شروع کی۔ نو جوان بہن

سے دو گڑاؤ پر گواٹھا۔ پھر انہوں نے رستی کے دوسرے سرے کو میرے
تنتے سے مضبوط باندھ دیا اور تڑپتے ہوئے جسم کا تماشہ دیکھتے رہے
تحتی کہ وہ سرد ہو کر ساکن ہو گیا تو پھر وہ سب واپس چلے گئے۔

میں نے کئی بار تیز ہواؤں سے التجا کی کہ وہ آسمان پر گر کر کتنی
ہوئی بجلی کی تلواریں کر میری اس شاخ کو تنے سے الگ کر دیں جس کو
ان باغی غلاموں نے اپنے ظلم میں شریک کیا۔ کتنی بار میں نے آرزو کی
کہ کاش اس شاخ کو کیڑے کھا جائیں اور یہ زمین پر بھیجی ہوئی گھاس کے
اوپر سرنگوں ہو جائے اور خزاں کے پتوں کی طرح اس کا نام و نشان
دنیا میں نہ رہے۔

لیکن میری تمام آرزوئیں ناکام رہیں۔ اس شاخ سلسی طرح
کلیاں چھوٹتی ہیں پھیل گئے ہیں اور یہ سورج کی روشنی سے لطف اندوز
ہوتی ہے۔ نیم کے بھونکنوں سے مست ہو جاتی ہے اور بارش کے پانی
سے ہنار خوشی سے پھولے نہیں سماتی۔ یہ شاخ عم کی اس کمافی کو بالکل
بھول گئی ہے اس شاخ کو دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ فطرت میری خواہش
کی پروا نہیں کرتی۔ میرا وجود میرے احساسات سے بے نیاز ہے اور

قدرت کے ارادے پر موقوف ہے۔ وہ ایک ایسے قانون کا پابند ہے جسکی کا پابند نہیں۔

ماضی میں اور بھی بہت سی واقعات پوشیدہ ہیں ان کی تعداد ششم کے ان قطروں سے بھی زیادہ ہے جو صبح کے وقت میرے تپوں پر پڑتے ہیں۔ اور وہ واقعات سورج کی شعاعوں اور عناصر کے تغیرات سے بھی زیادہ تعجب خیز ہیں۔ اگر میں ان تمام واقعات کو دہرانے لگوں تو میرے لئے لازم ہو گا کہ اپنے گزرے ہوئے زمانے کی طرف دوبارہ لوٹوں حالانکہ مجھے اس پر قدرت نہیں۔

لیکن زندگی کے تمام سرشت گیر لمحوں اور اندوہناک گھڑیوں مختلف مومنوں کی عنایات اور ان کے لائے ہوئے مصائب سے مجھے جو تجربات حاصل ہوئے ان سب سے محبوب اس چڑیا کی یاد ہے جو پہلی مرتبہ میری شاخ پر آکر بیٹھی جب میں بالکل نازک تھا۔ اس کے ننھے ننھے جسم کا بوجھ میں برداشت نہ کر سکا۔ اور اس کی وجہ سے مجھ میں اتنی خودداری پیدا ہوئی کہ میں بھی درختوں کی صفت میں شمار ہونے لگا۔ اس گھڑی کی یاد میں ایسے گہیت پوشیدہ ہیں جن کو میں غروب آفتاب کے وقت مسنتا ہوں اس

وقت کی یاد میں ایسے شعلے چھپے ہوئے ہیں جو پُر سکوں مات کی خاموشی
 میں مجھے نظر آتے ہیں۔ اس لمحہ کی یاد میں محبت، غم اور سوز ہے اور
 اسی میں صبر و قناعت۔

مستقبل پر ایک نظر

حاضر کے پردوں کے پیچھے سے میں نے انسانیت کی تسبیحیں
سنیں۔

ایسی گھنٹیوں کی آوازیں میرے کانوں میں پڑیں جو جمال کی
عبادت گاہ میں عبادت کے وقت کا اعلان کرتی ہوئی، نفا کے ذمے دے
کو بیدار کر رہی تھیں — اور جو قوت و اختیار کے مقدس مندر پر لٹکائی
گئی تھیں — انسان کا دل۔

مستقبل کے پردوں کے پیچھے مجھے ایسی جماعتیں نظر آئیں جو

مشرق کی طرف منہ کئے فطرت کے مسئلے پر سجدہ میں پڑی تھیں اور صبح کی روشنی کی منتظر تھیں — حقیقت کی صبح۔

میں نے اُجڑے ہوئے شہر پر ایک نگاہ ڈالی۔ اس کے آدھے مٹے ہوئے آثار یہ بتا رہے تھے کہ تاریکی کی جگہ ڈورنے لے لی ہے۔
میں نے بوڑھوں کو دیکھا کہ وہ اخروٹ کے درختوں کے سائے میں بیٹھے ہیں اور بچے ان کے ارد گرد بیٹھے ہوئے ماضی کی باتیں سن رہے ہیں۔

میں نے نوجوان لڑکوں کو دیکھا جو چنبیلی کی سیل کے نیچے بیٹھے
نئے دسرود سے کھیل رہے ہیں اور نوجوان لڑکیاں اپنی پریشان زلفوں
کے ساتھ ان کے ارد گرد ناچ رہی ہیں۔

میں نے کسانوں کو دیکھا جو کھیتی کاٹنے میں مصروف ہیں۔ اُن
کی عورتیں فصل اُٹھا اُٹھا کر لے جا رہی ہیں اور مسرت و خوشی کے گیت
گانے میں مصروف ہیں۔

میں نے ایسی عورتوں کو دیکھا جو بھر کیلے لباس کی جگہ چنبیلی کے چھوٹے
اتاج اور سرسبز تپوں کا لباس زیب تن کئے ہوئے ہیں۔

میں نے انسان اور دوسری مخلوقات میں محبت کو استوار پایا۔ پرندوں کے جھنڈ بے خوف و خطر انسانوں کے قریب آتے ہیں۔ سرخسوں کے غول اطمینان سے تالاب پر پانی پینے آتے ہیں۔

میں نے غریبی اور سرمایہ داری کی جگہ بھائی چارہ اور سادات کا دور دورہ پایا۔

میں نے کسی ڈاکٹر کو نہیں دیکھا۔ اس لئے کہ ہر شخص اپنے تجربے اور سمجھ کی وجہ سے اپنا ڈاکٹر آپ ہے کسی نجومی کو بھی نہیں دیکھا اس لئے کہ ہر ایک کا اپنا ضمیر ہی سب سے بڑا نجومی ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ انسان سمجھ گیا ہے کہ وہی مخلوقات کا محور ہے۔ اسی وجہ سے وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ کیونکہ حرکات سے دور رہتا ہے۔ اس نے اپنے نفس کی بصیرت سے شک و شبہ کے پردوں کو ہٹا دیا ہے۔ اس وجہ سے وہ آسمان کی چادر پر بادل کے لکھے ہوئے خط کو پڑھ لیتا ہے، پانی کی سطح پر نسیم سحری کے بکھرے موتیوں کو چہن لیتا ہے، کلیں کی سرگوشیوں کو سمجھ لیتا ہے اور چشمے کے میٹھے سرد پانی کے بلبلوں سے پیداشتہ

آواز کے معانی کو پہچان جاتا ہے۔
 حاضر کی چار دیواری کے نیچے — مستقبل کے منبر و زار
 میں، میں نے جمال اور نفس کو نئے لباس میں دیکھ لیا اور ساری زندگی
 کو شب قدر پایا۔

ماضی کی جستجو

نبات نے مجھے جوانی کے بلند پہاڑ کی سطح پر لا کھڑا کیا اور مجھے اشارہ کیا کہ اپنے پیچھے نظر ڈالو۔ میں نے اپنے پیچھے نگاہ ڈالی۔ مجھے ایک اجنبی شکل، صورت کا ایک شہر نظر آیا جو میدان کے اُس پار مزاح شکل میں کھڑا تھا۔ مختلف خیالات اور رنگین بخارات اس میں چکر کاٹ رہے تھے۔ لطیف سی کمر اس پر ایسی چھاپ رہی تھی جو اسے آنکھوں سے ادھل کر رہی تھی۔

میں نے پوچھا: اُسے حیات! یہ کیا ہے؟ اُس نے کہا: یا ماضی

کی لبتی ہے اس پر غور سے نظر ڈالو۔

میں نے غور سے دیکھا تو مجھے نظر آیا کہ — اعمالِ نیند کی آغوش میں بڑے بڑے جابر دلوں کی طرح بیٹھے ہیں۔ کلام کی مسجدیں نظر آئیں جن کے ارد گرد روہیں مایوسی کی چرخِ پکار اور اُمید کے گیت گانے میں مصروف تھیں۔ مذہب کے مجسمے نظر آئے جو لفظ کی بنیادوں پر قائم تھے۔ لیکن شکوک و شبہات کی کثرت نے ان کی عمارت کو ڈھا دیا۔ افکار و خیالات کے بلند مینارِ سائل کے ہاتھوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ میلانات کے راستے ایسے کشادہ دکھائی دے رہے تھے جیسے ٹیلوں میں سے گذرنا ہوا دریا۔ اسرار کے خزانے نظر آئے جن کی حفاظت تو ہوتی رہی لیکن جاسوسیوں نے ان پر ہاتھ صاف کر لیا۔ اُدنیچے عزائم کے مضبوط برج دکھائی دیے جو شجاعت کی بنیادوں پر قائم تھے لیکن خوف و ہراس نے ان میں شکات ڈال دیئے۔ بیٹھی خوابوں کے محل نظر آئے جو تاریک راتوں میں بہت خوبصورت دکھائی دے رہے تھے لیکن بیداری نے انکے تمام حسن کو ملیا میٹ کر دیا۔ کمزوری کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ

جھبڑ پڑے دیکھیے حقیقت معرفت کی محفلیں کھیں جو عقل کے نور سے روشن
تھیں لیکن جبل کی ظلمت نے ان کو تاریک بنا دیا۔ محبت کے شراب خانے
نظر آئے جن میں عاشق مدہوش پڑے تھے لیکن خمر نے ان کی مستی کو
نفا کر دیا۔

وہ ماضی کی لستی ہے جو دُور بھی ہے اور قریب بھی — نظر
بھی آرہی ہے اور نظر سے پوشیدہ بھی۔ اس کے بعد حیات میرے آگے
آگے چلی اور کہا! کھڑے کھڑے بہت دیر ہو گئی اب پیچھے چلے آؤ۔
میں نے پوچھا! اے روحِ حیات! کہاں جانا ہے؟
اُس نے جواب دیا! مستقبل کی لستی کی طرف۔

میں نے کہا! ذرا اٹھ جاؤ۔ چلتے چلتے میں تھک گیا ہوں ٹیلوں میں
میرے پاؤں زخمی ہو چکے ہیں اور گھاٹیوں میں چلتے چلتے میرے قویٰ جواب
دے چکے ہیں۔

اُس نے کہا! چلتے رہو۔ ٹھیرنا بزدلی ہے اور ماضی کی لستی کو دیکھتے

رہنا جہالت ہے۔

کے ناقابل ہوتے ہوئے بھی اس کے دل کی تسکین کا سبب تھا

جب لوگوں کا شور و شر کم ہوا۔ راستے خالی ہو گئے۔ بیچاری — پ
 بچے کو گود میں اٹھایا۔ اس کی حکمتی ہوئی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے
 دیکھا اور بڑے درد سے رونے لگی اور ایسی دردناک آواز سے جس کو سن
 کر سخت چٹان بھی کھیل جاتے۔ کہنے لگی ”میرے جگر کے ٹکڑے! تو عالم
 ارواح سے کیوں آیا؟ کیا میری تلخ زندگی کا حصہ دار بن کر؟ میری کمزوری
 پر رحم کھا کر؟ تو نے زشتیوں کی وسیع آبادی کو کیوں چھوڑا اور اس ذلت و
 بدبختی سے بھری ہوئی دنیا میں کیوں قدم رکھا؟ میرے لال! میرے پاس
 آنسوؤں کے سوا اور کچھ نہیں کیا تو دودھ کے بدلے آنسو پیئے گا؟ کیا
 میرے ننگے بازو تیرے لئے کپڑوں کا کام دے سکیں گے؟ جانوروں کے
 بچے گھاس پر گزارہ کر کے امن سے رات بسر کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے
 پرندے دانے چگ کر درختوں کی شاخوں پر سوتے ہیں لیکن آہ! میرے کمن
 بچے تجھے میری ٹھنڈی آہوں اور میری کمزوری کے سوا اور کوئی چیز میسر نہیں
 آسکتی؟

اتنا کہہ کر اس نے بچے کو اس دور کے ساتھ سینے سے لگایا۔ جس سے

معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان دونوں جیبوں کو ایک کر دینا چاہتی ہے۔ انکھیں
 اوپر اٹھا کر چنبنے لگی اور کہا۔ اے میرے پروردگار! ہم پر رحم کر۔
 جب باڈل چاند کے چہرے سے چھپ گئے۔ اس وقت اس کی
 لطیف کرنیں اس شکستہ گھر کی کھڑکی سے اندر پھنپیں اور دجیموں پر پڑنے
 لگیں جو سرد ہو چکے تھے.....

کر دیا۔
 سنگدہر گھر دیکھا
 ماحول غریب

زمانہ — اور — قوم

لبنان کی پہاڑیوں کے دامن میں گھاٹیوں کے درمیان چاندی کی سفید سلاخ کی طرح نظر آنے والی ندی کے کنارے کانٹوں کے درمیان اگی ہوئی خشک گھاس کو چرنے والی کمزور اور دہلی بھٹیروں کے گلے سے گھری ہوئی چرواہی بیٹھی ہے — ایک لڑکی جو درشفق کی طرف اس طرح غور سے دیکھ رہی ہے جیسے وہ فضا کی سطح پر اپنی زندگی کے آئندہ واقعات کو ایک ایک کر کے پڑھ رہی ہے۔ آنسوؤں کی بوندیں اس کی گول گول آنکھوں میں یوں نظر آرہی تھیں جیسے زگس میں شبنم کے قطرے۔ شدتِ غم سے اُس کا

مُنہ کھلا ہوا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی ٹھنڈی آہوں کے راستے اپنا
دل باہر نکال دینا چاہتی ہے۔

شام کے وقت جب سایوں کی تاریکی آس پاس کے ٹیلوں پر پھیلنے
لگی تو ایک بوڑھا کسان اس لڑکی کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اس کے سفید بال
اس کے سینے اور شانوں پر لٹک رہے تھے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ٹھکڑا
درانتی تھی اور اس کی آواز موجوں سے اٹھتی ہوئی صدا کے مشابہ تھی
اس نے کہا:-

”ملک شام پر سلام ہو۔“

لڑکی کا نہتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ خوفزدہ اور غلگین آوازیں اُسے محسوس
ہو کر کہنے لگی ”آزمانے آؤ اب مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ پھر اپنی بھڑوں کی
طرف اشارہ کر کے کہنے لگی ”موشیوں کے اُن گلوں میں سے صرف یہی کچھ
باقی بچی ہیں جن سے یہ وادیاں بھر جاتی تھیں۔ کیا آؤ اب اور لینے آیا ہے۔“
یہی دہی چراگاہیں ہیں جو نیرے قدموں کی وجہ سے خشک ہو رہی
ہیں۔ یہ کسی وقت سرسبز وادیاں تھیں اور ہماری روزی کی مکمل ضرورت میری
بھڑیکبریاں ان سبزہ زاروں میں چرا کرتی تھیں اور پاک و صاف دودھ دیتا

کرتی تھیں۔ لیکن اب دیکھو۔ ان کے پیٹ خالی ہیں۔ وہ کانٹے توڑ رہی
 اور موت سے بچنے کی خاطر درختوں کی جڑوں پر گزرتی رہی ہیں۔
 زمانے! خدا سے ڈر۔ میرے سامنے نہ آ۔ تیرے مظالم کی یاد نے
 مجھے زندگی سے متنفر کر دیا ہے تیری درانسی کی سختی کو دیکھ کر میں موت کو پیار
 کرنے لگی ہوں۔

مجھے تنہا ہی رہنے دے تاکہ میں اپنے آنسو شراب سمجھ کر پیوں،
 بچے غم کو نسیم سحری سمجھوں اور زمانے! تو اس مغرب کی طرف چلا
 جا تھاں تو میں زندگی کی بہاریں دیکھ رہی ہیں۔ خوشی کی عیدیں منا رہی
 ہیں اور مجھے چھوڑ دے کہ تیسری لائی ہوئی بدقسمتیوں کو رد رہی
 ہوں۔“

بڑھے نے دانستی کو کپڑوں میں چھپاتے ہوئے مہربان باپ کی طرح
 اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:-

”شام کی سرزمین! میں نے تو صرف بی ہوتی نعمتوں کا ایک حصہ
 تم سے واپس لیا ہے اور یقین رکھو کہ میں کسی کا حق چھیننے والا نہیں بلکہ
 چند دن کے لئے مستعار لے کر واپس لٹا دیا کرتا ہوں اور واپس کرتے

وقت اس حق میں معمولی سا نقصان بھی گوارا نہیں کرتا اور لڑتین رکھو کہ تمہاری ہم عصر قوموں کو جو کچھ ملا ہے وہ اس شرافت کی طفیل ہے جو کبھی تمہاری غلام تھی۔ وہ اس لباس کی وجہ سے ہے جو کبھی تمہارا تختہ میں اور انصاف ایک ہی ذات کے درجہ پر غلبہ ہے۔ یہ میرے لئے مناسب نہیں کہ جو کچھ تمہیں دیا تھا۔ وہی اب تمہاری ہم عصر قوموں کو نہ دوں۔ محبت کی تقسیم میرے دربار میں انصاف سے ہوتی ہے میں اب تم دونوں سے کیساں محبت کیسے کروں؟ شام کی سرزمین! تمہیں اپنی پڑوس کے ممالک مصر، ایران اور یونان سے سبق لینا چاہئے۔ ان کے ریڈ بھی ایسے ہی ہیں جیسے تمہارے ہیں اور ان کی چراگاہیں بھی اسی طرح سبکھی ہیں جس طرح تمہاری ویشام کی سرزمین! جس حالت کا نام تم انحطاط رکھ رہی ہو۔ میں اسے غفلت سے تعبیر کرتا ہوں جس کے بعد یقیناً عمل اور خوشی کا دور آنے والا ہے۔ کلی مرکو ہی زندہ ہوتی ہے اور محبتِ جُذباتی کے بعد ہی ترقی کرتی ہے۔

بڑھاپہ کی طرف آگے بڑھا اور اپنا ہاتھ بڑھا کر کہنے لگا: "اے پیغمبروں کی بیٹی! مجھ سے ہاتھ ملا۔" لڑکی نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ آنسوؤں کی آڑ میں وہ اس کی طرف دیکھتی رہی اور کہنے لگی: "زمانے رخصت!"

بوڑھے نے جواب دیا ! "شام کی سرزمین ! عنقریب پھر ملیں گے"
 اسی وقت بوڑھا بجلی جیسی تیزی کے ساتھ چھپکپکایا اور بوڑھی
 نے اپنے مولشی اکٹھے کرنے شروع کئے۔ وہ کہتی جا رہی تھی۔ "تعب ہے
 گیا وہ عیش رفتہ واپس مل سکتا ہے؟"

اپنی اپنی بول

تمہاری اپنی بولی ہے اور میری اپنی۔

زبان میں تمہارا حصہ وہی ہے جو تم پسند کرتے ہو اور میرا حصہ وہ ہے

جو میرے انکار و خیالات کے موافق ہو۔

تمہارے لئے زبان کے الفاظ اور ان کی ترتیب ہے اور میرا حصہ

معانی ہیں جن کی طرف الفاظ اشارہ تو کرتے ہیں لیکن ان کو چھو نہیں سکتے ترتیب

ان کی طرف مائل تو ہوتی ہے لیکن وہاں اس کی رسائی نہیں ہوتی۔

تمہارے حصے میں صرف ٹھنڈے بے جان لاشے ہیں اور تمہارا خیال

ہے کہ وہی سب کچھ ہیں۔ میرے حصے میں وہ اجسام ہیں جن کی ذات کی کوئی قیمت نہیں۔ ساری قیمت ان ارواح کی ہے جو ان میں پوشیدہ ہے۔

تمہارے حصے میں اس کا ایک خاص مقرر معیار ہے اور میرے حصے میں ہر وقت اس کی حیثیت ہے کہ وہ ایک واسطہ ہے جو بدلتا رہتا ہے اور اُسے میں اُس وقت تک کافی نہیں سمجھتا جب تک وہ میرے دل کے بھینٹوں کو دوسروں کے دل تک اور میری ضمیر کی آواز کو اداروں کی ضمیر تک پہنچا۔ تمہارے حصے میں اس کے متعین قواعد اور محدود و خشک قوانین ہیں لیکن میرے حصے میں وہ نغمے ہیں جن کی سُرور کو میں بدل بدل کر اپنی فکر کی سُرور اور دل کے تاروں سے ملاتا رہتا ہوں۔

تمہارے حصے میں زبان کے مکھے ہوئے لغات، ڈکشنریاں و ضخیم گتا ہیں لیکن میرے حصے میں کانوں سے چھپنے ہوئے اور حافظہ میں بیٹھ ہوئے وہ الفاظ ہیں جن سے لوگوں کے کان آشنایں اور جن کو لوگ ہر خوشی اور غم کے موقع پر استعمال کرتے رہتے ہیں۔

تمہاری اپنی بولی ہے اور میری اپنی۔

تمہارے حصے میں اس کا علم عروض، اس کے اوزان کی تفاعیل، قوافی اور اس کے جائز و ناجائز سے بھری ہوئی بخشیں ہیں اور میرے حصے میں وہ چشتے ہیں جو سمندر کی طرف تیزی سے بہتے ہوئے گاتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ مگر اس کا راستہ روکنے والی چٹانوں سے پیدا ہوتا ہے یا خزاں کے گرنے والے اُن تپوں سے جو اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

تمہارے حصے میں بڑے بڑے معجز، سودائی شاعر اور وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کے اشعار پر تفسیر کی یا ان کے بند سے بند ملا یا ان کے اشعار کی تشریح لکھیں اور میرے حصے میں وہ تخیلات ہیں جو اُن شاعروں کے دلوں میں ڈرتے ڈرتے چکر کاٹتے ہیں جنہوں نے نہ کبھی ایک شعر کہا اور نہ ایک سطر عبارت لکھی۔

تمہارے حصے میں مرثیے، مدحیہ اور فخریہ قصائد اور تہنیت نامے ہیں لیکن میرا حصہ وہ اشعار ہیں جو ماں کے پیٹ سے ہی مرے ہوئے نکلنے والے انسان کیلئے مرثیہ کے طور پر مستعمل نہیں ہو سکتے اور نہ مخمل اڑانے کے قابل انسانوں کی مدح کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں۔ وہ قابلِ رحم انسان کو مہار کا دینے سے کتراتے ہیں۔ وہ ایسے شخص کی سبجو کرنے سے اپنے

آپ کو بلند تر سمجھتے ہیں جن سے آنکھیں بند کی جاسکتی ہیں وہ فخر و غرور کو بُرا جانتے ہیں۔ اس لئے کہ انسان کے پاس اپنے عجز و جہل کے اقرار کے علاوہ کوئی فخر کے قابل چیز ہے ہی نہیں۔

تمہاری اپنی بولی ہے اور میری اپنی۔

تمہارے لئے تمہاری زبان کا علم بذلح بیان اور منطق ہے اور میرے لئے کمزور کی آنکھوں کی ایک نگاہ۔ عاشق کے ملکوں میں جھپکتے ہوئے آنسو۔ مومن کے ہونٹوں پر کھلبلی ہوئی مسکراہٹ اور عالی ظرف فلسفی کے ہاتھ کا اشارہ ہے۔

تمہارے حصے میں وہ اقوال ہیں جو سیبویہ، اسود، ابن عقیل اور ان جیسے ننگدل اور زود رنج لوگوں کی زبان سے نکلے۔ میرے حصے میں پیار کے وہ جملے ہیں جن سے ماں اپنے بچے کو عاشق اپنے محبوب کو اور زنا ہد شب زندہ دار رات کے سکون کو مخاطب کرے۔

تمہارے حصے میں ”رکیک“ الفاظ کے بدگئے فصیح اور مبتذل الفاظ کی جگہ ملیخ الفاظ ہیں اور میرے حصے میں وہ الفاظ ہیں جو وحشت زدہ انسان کی زبان سے رُک رُک کر نکلتے ہیں۔ دردناک انسان کے گلے سے بُری شکل ملے یہ عربی زبان کے علم صرف و نحو کے مشہور اُستاد ہیں۔

سے باہر آتے ہیں اور جو قیدی کی زبان پر جاری ہوتے ہیں اور یہ سب کے سب
میری نظر میں فصیح و بلیغ ہیں۔

تمہارے حصے میں زبان کی مضبوط بنیادیں ہیں لیکن میرے حصے میں کوتاہی
اور لبلب کے چھپے ہیں جو خیال کے کھیتوں اور بنروزاروں میں ادھر ادھر اڑتی
پھرتی ہیں۔

تمہارے حصے میں چاندی کے بنے ہوئے تین ہیں لیکن میرے حصے میں
بارش کی بھوار، بازگشتِ عداوتیں اور بید و سفید کی تپتوں سے کھیلنے والی
ٹھنڈی نسیم سحر ہے۔

تمہارے حصے میں نزوح، تنزیل، تینق اور خدا معلوم اور کیا کیا تفصیل
بلائی ہیں لیکن میرے حصے میں وہ سادہ کلام ہے کہ منہ سے نکلتے ہی سننے والا
اُس کی تہ تک پہنچ جاتا ہے اور جب لکھا جاتا ہے تو لکھنے کے ساتھ ہی پڑھنے
والے کو غیر محدود و فزائیں نظر آنے لگ جاتی ہیں۔

تمہارے حصے میں زبان کی ماضی اور ماضی کے شاندار کارنامے اور
مفاخر ہیں لیکن میرے حصے میں اس کا حال اور مستقبل ہیں وہ حال جو مستقبل
کی تیاری میں مصروف ہے اور وہ مستقبل جو اس کی آزادی اور استقلال

کا ضامن ہے۔

تمہاری اپنی بولی ہے اور میری اپنی۔

تمہاری بولی سے تمہارے حصے میں بڑے معنی ہے جو تمہارے لئے ہاتھ میں تیار لے کر اس کے تاروں کو چھیڑتا ہے اور اس کی سخت انگلیاں اس سے اپنے پسند کے نغمے نکالتی ہیں۔ میری بولی سے میرے حصے میں ایسی سازنگی آئی ہے جس کو ہاتھ میں لے کر اس سے ایسے راگ نکالتا ہوں جس سے میری رُوح خواب جیسا نشہ محسوس کرتی ہے اور میری انگلیاں ان تاروں کو اور زیادہ چھیڑتی ہیں۔

تمہارے حصے میں بس اتنا ہی ہے کہ اپنی اپنی بولی کو ایک دوسرے کے کانوں تک پہنچاؤ اور صرف آپس ہی میں خوشی محسوس کر کے ایک دوسرے کی تعریفیں کرنے لگ جاؤ لیکن میرے حصے میں دُھ مٹھی بولی ہے جسے میں صرف ہوائے جھونکوں اور سمندر کی موجوں تک پہنچاتا ہوں اس لئے کہ ہوا کے کان تمہارے کانوں سے زیادہ اس بولی کو سُسنے کی قابلیت رکھتے ہیں اور سمندر کا دل تمہارے دلوں کی بہ نسبت زیادہ جگہ دیتا ہے۔

تمہارے حصے میں یہی ہے کہ اپنی بولی کے بوسیدہ لباس کے گرے پڑ
چلتی پھرتے اٹھا اٹھا کر جمع کر لیا کرو لیکن میں ہر پرانے اور بوسیدہ لباس کے
اپنے ہاتھوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا کرتا ہوں اور پھاڑ کی چوٹی تک پہنچنے
کی راہ میں جو چیز بھی حاصل ہوتی ہے میں اس کو راستے کے دونوں جانب
پھینک دیا کرتا ہوں۔

تمہارے حصے میں یہی ہے کہ اپنی بولی کے بیکار اعضا کی حفاظت
کرنے رہو اور ان کو اپنی عقل میں محفوظ کر لیا کرو لیکن میل کام یہ ہے کہ میں ہر
مردہ عضو اور شل حصے کو آگ سے جلا دیا کرتا ہوں۔

تمہاری بولی اپنی ہے اور میری اپنی۔
تمہارے حصے میں تمہاری بوڑھی اور لولی لنگڑی زبان ہے اور میرے
حصے میں حسین خوابوں کے سمندر میں تیرنے والی نوجوان دوشیزہ جیسی بولی ہے
مجھے بتاؤ کہ تمہاری اپاہج اور میری نوجوان بولی سے پردے اٹھا
دیئے جائیں تو ان کا انجام کیا ہوگا ؟
میں بتاؤں !

تمہاری بولی کی کوئی حقیقت نہیں رہیگی۔
 جس دینے کا تیل ختم ہو چکا ہو وہ زیادہ دیر تک جلنے کے قابل نہیں
 آگے بڑھتی ہوئی زندگی اپنے پیچھے رُخ نہیں پھیرا کرتی۔
 تابوت کی ٹکڑیوں میں کبھی پھول نہیں کھل سکتے اور نہ ان میں پھل لگ
 سکتا ہے۔

جسے تم ”بیان“ کہتے ہو اس کی حقیقت زکشی کہتے ہوئے بانجھ پن اور کلس
 لگائی ہوئی دکالت کے سوا کچھ نہیں۔

تمہارے دلوں کی گرمی تمہیں الفاظ کی معمولی معمولی سونوئوں کی طرف
 بادلِ ناخو استہ دوڑا بیگی۔

تمہارے دلوں کی سختی تمہیں اپنی زبانوں کی نرمی پر مجبور کر بیگی اور تمہا
 خیالات کی تحفارت تمہیں غلام بنا کر نیچے گی۔

یہ صدی گزرنے نہیں پائیگی کہ تمہاری ہی اولاد میں سے تمہارے
 قاتل اور جلاد پیدا ہونگے۔

شاعر ایک پیغام ہے جو رُوحِ کل کا پیغام ایک ایک رُوح تک
 پہنچاتا ہے اگر کسی میں پیغام پہنچانے کا یہ وصف موجود نہیں تو یقین رکھو کہ

وہ شاعر بھی نہیں۔

ادیب سچی باتیں بتانے والا انسان ہے — اگر
کسی کے پاس کوئی سچی اور واقعیت پر مبنی بات نہیں تو وہ
ادیب ہی نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ نظم و نثر فکر اور جذبات کا دوسرا نام ہے
اس کے علاوہ جو بھی ہے۔ اس کی حقیقت کچھ دھاگے اور دانداز
ہونے والی لڑی سے زیادہ نہیں۔

اور اب جب حقیقت کی صبح طلوع ہو چکی ہے — اب
بھی تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہاری بولی کی شکایت اس لئے کرتا
ہوں کہ اپنی زبان کی فوقیت ثابت کروں؟ نہیں۔ اس ذات کی
قسم جس نے مجھے تمہاری آنکھوں اور ناک کے لئے آگ اور دھواں
بنایا ہے کبھی نہیں۔

زندگی کبھی موت کے سامنے اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے
کی کوشش نہیں کرتی حقیقت کبھی اپنی ذات کی تشریح

"Among generations of men
 not believe that a man was
 in their country. Khalil sings the
 songs of Love and Freedom."
 باطل کے سامنے نہیں کرنی۔ قوت بھی ضلالت کے سامنے خرفزد
 نہیں ہوتی۔

تمہاری اپنی بولی ہے اور میری اپنی۔

Khalil Gibran was born in
 Lebanon in Bashrie. The year of
 his birth was 1883, and he
 died in 1931. He was the lover
 of Arabic literature, he was
 proud of his orientalism. He
 was a great philosopher, a
 great friend of the poor, and the
 enemy of capitalists. His other
 books are 'The prophet', 'Sand
 and Foam', 'The Fomenner',
 'Jesus the son of man', 'Spirits
 Rebellious', 'The Madman', 'Fears

in his life in the classroom even
 "Khalil was a great man of world"
 "How Gibran died? Why the death not come
 to death"

